اعتنا کا کبھی محتاجِ غمِ دل نہ رہا
نہ سنا گُل نے تو کیا شورِ عنادل نہ رہا

نقوشِ مانی

مجموعۂ منظومات سیّد کلب احمدؐ مانی جائسی

پبلشرز

منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ

دھلی - الہ آباد - انبالہ شہر
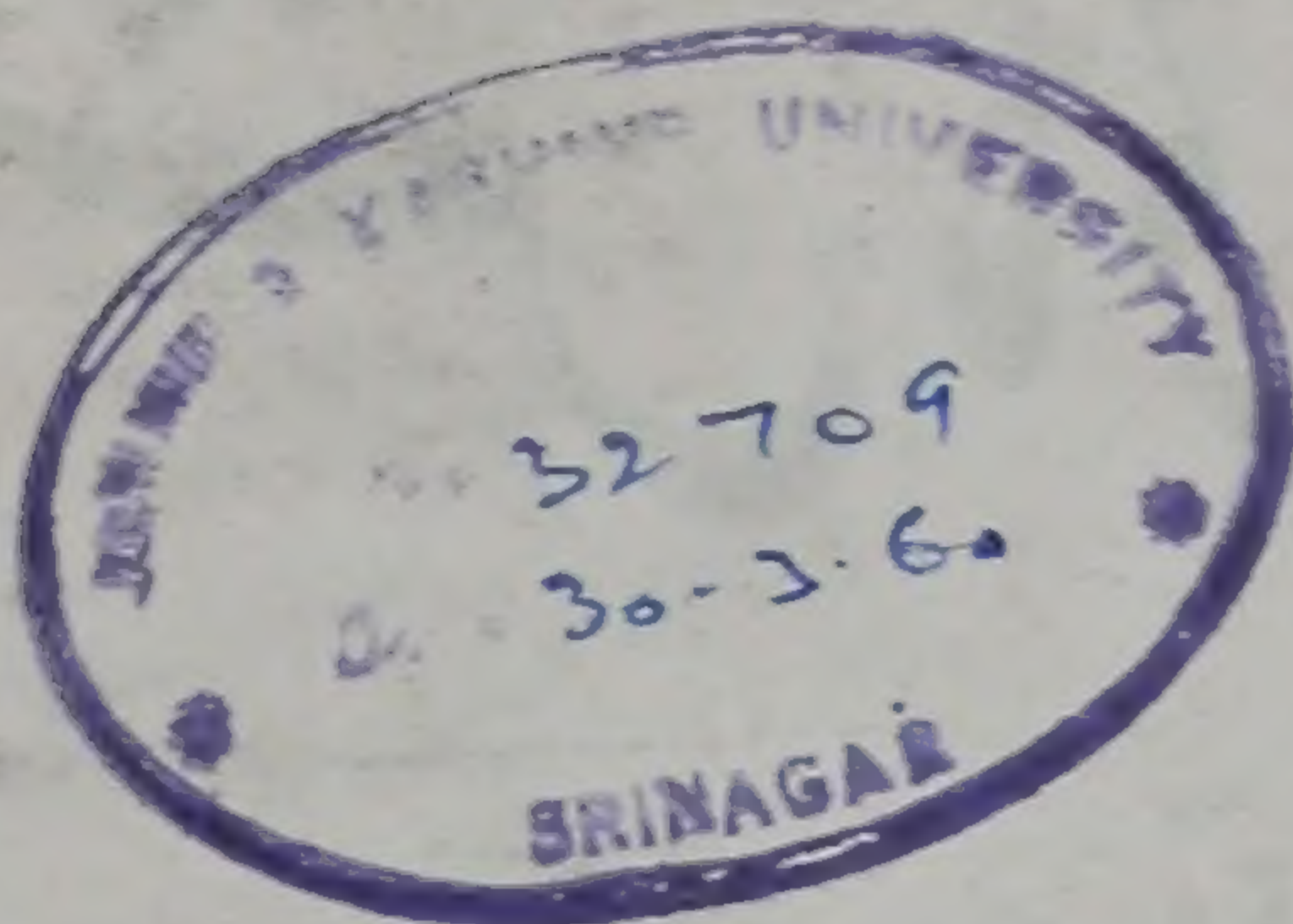
پہلی بار

قیمت ۲ روپے

میں وہ ہوں کہ رہروِ عشق کو نہ رہی ضرورتِ رہنما
کہ ہیں میرے سجدۂ بیخودی کے نقوش راہِ نیاز میں
آسی جاسی

بسمہ سبحانہ

دیباچہ

تمہید کریم النفس انسان بالطبع دل نواز ہوتا ہے، اور محبت کرنے والا امتیاز نیک و بد سے بے نیاز۔

اِس کتاب کی اشاعت ایسے ہی حضرات کے[1] اصرار اور فرمائش کی ممنون ہے، ورنہ ساری عمر کی کائنات اتنے مختصر سے مجموعے کو نمائش گاہ علم و ادب میں پیش کرنا کوئی بڑی خوش آئند بات نہ تھی، خصوصاً جب میں ایسے اہلِ نظر اور اربابِ ذوق کے لئے ناقابلِ التفات بھی سمجھتا ہوں۔

اختصار کے لئے تو خیر ایک عذر ہو سکتا ہے کہ ایک مجموعہ ۱۹۰۶ء میں اور دوسرا ۱۹۱۴ء میں ضائع ہو گیا۔ پہلے مجموعے

---

[1] اصرار کرنے والوں میں برادر عزیز سید کلب مصطفیٰ صاحب سلمہ اللہ بی۔اے کا نام جلی حرفوں میں لکھا جا سکتا ہے۔

کے دو ایک چار شعر یاد رہ گئے ہیں اور چونکہ وہ متفرق ہیں اس لئے اس کتاب میں شامل نہیں کئے گئے۔ ہاں دوسرے مجموعے میں سے جو کچھ یاد آسکا وہ درج ہوا۔

ایک اور سبب بھی اختصار کا ہے، یعنی یہ کہ میری شاعری ہمیشہ جذبات کی تابع رہی، آپ ملاحظہ کریں گے کہ مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں شعر کہنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا، اور یہ حقیقت تاریخ تصنیف سے واضح ہوگی جو ہر تصنیف کے شروع میں لکھ دی گئی ہے۔

اسلوب ترتیب میں نے اپنا کلام تاریخ کی ترتیب سے جمع کیا ہے جس کا ایک ضمنی فائدہ تو وہ ہے جو اوپر عرض کیا گیا لیکن اصل غایت اس اسلوبِ ترتیب کی یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ، تغیرِ حالات اور

لہ مثلاً۔ کیا مٹے درد، وہ بے درد، میں لذت کش درد
اُس نے مٹنے نہ دیا، میں نے مٹانے نہ دیا

یا۔ جیسی آئینہ سی صورت تجھے دی ہے اس نے
ایسا آئینہ سا دل تجھ کو خدا نے نہ دیا

یا۔ جنوں چھوٹا رہا ہے اب یہ تنکے ورنہ اسے مانی
خدا ناکردہ پھر قصدِ بنائے آشیاں کیوں ہو۔ وغیر ذالک

ترقی مشق کے جو آثار رنگِ طبیعت، جذبات اور کلام پر مترتب ہوئے ہیں، اُن کا اندازہ مطالعہ کرنے والے کو ہو سکے، اور شائد یہ اندازہ مطالعے کو دلچسپ اور ایک حد تک مفید بنا سکے۔

اعتراف یوں تو نکتہ بین نگاہیں اور دقیقہ سنج طبائع خدا جانے کتنی فروگذاشتیں اس ناچیز مجموعے کے ہر شعر میں پائیں لیکن بعض خاص اُمور کی طرف میں خود ملتفت کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) دو ایک مقام پر شائگاں ہے۔

(۲) دو ایک شعروں میں "نہ" کی معنوں میں "مت" استعمال ہوا ہے جسے متروک سمجھا جاتا ہے، اسی طرح کئی جگہ "سو" بھی نظم ہوا ہے۔

(۳) برق یا بجلی کے لئے "گرنا" عموماً استعمال ہوتا ہے، میں نے غالباً دو ایک شعروں میں "ٹوٹنا" استعمال کیا ہے۔

(۴) "وہاں" کی جگہ "واں" اور یہاں" کی جگہ "یاں" تو جہاں تک مجھے خیال آتا ہے، اس مجموعے میں کہیں نہ ملے گا۔ "اگر" کے بجائے "گر" کا استعمال بھی تقریباً سولہ سال سے میں نے ترک کر دیا ہے

امتنان میں اُن فاضل اور ادیب دوستوں کا بدرجہ غائت ممنون ہوں جنھوں نے از راہِ کرم رواجِ عام کے مطابق اس ناچیز مجموعے کو بھی مقدمے سے زینت بخشنے کا خیال اور قصد ظاہر فرمایا۔ لیکن میں تو

ابھی ان چند سطروں کو بھی جگہ نہ دیتا اگر اشد ضرورت محسوس نہ کرتا۔

مزید تفصیل کا سبب میں دیباچے کو ختم کرچکا تھا کہ اتفاق سے شفیق معظم جناب شوکت علی خاں صاحب فانیؔ بدایونی (بی۔اے، ایل ایل۔بی) سے ملاقات ہوئی۔ وہ مندرجۂ بالا سطور کو ناکافی خیال فرماتے ہیں، اور مصر ہیں کہ دیباچہ ایسا ہونا چاہئے جس سے مصنف کے سوانح حیات تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ضرور معلوم ہوسکیں۔ خیر، جو کچھ یاد آتا ہے لکھے دیتا ہوں۔

نسبی حالات راقم کا سلسلۂ نسب دادھیال اور ننھیال دونوں طرف سے امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ ننھیال میں تو خیر شاہان اودھ کے زمانے میں بہت کچھ ثروت رہی؛ لیکن دادھیال والے ہمیشہ استغنا برتتے رہے، اور باوصف امکان[1] کبھی

---

[1] جدِ اعلیٰ مولوی سید عصمت اللہ صاحب اعلی اللہ مقامہٗ عہدِ اورنگ زیب میں شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ نو لاکھ روپیہ محاصل کی جاگیر عطا ہوئی، ضرورت سے زیادہ ہونے کا عذر فرمایا اور باوجود اصرار قبول نہ کی جب بحصولِ رخصت وطن آنے کو ہوئے تو شہنشاہ نے پہلے سے قاصد کے ذریعے عطائے جاگیر کا فرمان اس پیام کے ساتھ مکان پر بھجوا دیا کہ مولانا کو سمجھا کر جاگیر لے لینے پر آمادہ کیا جائے۔ دو ایک روز بعد جب خود مولوی سید عصمت اللہ صاحب وطن پہنچے تو جدۂ معظمہ نے خوشی خوشی فرمان پیش کیا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کو واپس ہوئے تو اس پروانے کو بھی ساتھ لیتے گئے اور معذرت کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔

مایحتاج سے زیادہ معاش پسند نہ کی۔ دولتِ علم کو البتہ پشت ہا پشت سے ارث ابائی کا مرتبہ حاصل تھا اور بحمد اللہ ہے۔

پیدائش والد ماجد جناب مولوی سید کلب جعفر صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے ملازمت انگریزی اختیار فرمائی اور اس ذریعے سے دیوریا ضلع گورکھپور میں قیام فرماتے تھے جب راقم کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر آیا۔

استعدادِ شاعری بالکل اوائل ایام کے حالات تو نہیں لیکن تقریباً چار برس کی عمر تک کے واقعات اکثر

لہ جدِ امجد جناب مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ، عم معظم جناب مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ اور اُن کے فرزند برادر معظم جناب مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ، عم محترم جناب مولانا سید کلب باقر صاحب قبلہ اور اُن کے فرزند اخ المکرم جناب مولانا سید کلب مہدی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہم میں سے اکثر ایسے بزرگ ہیں جن کے فضل و کمال کا سکہ ہند سے لے کر عراق تک رائج رہ چکا ہے اور بڑے جید علما و مجتہدین میں شمار کئے جاتے تھے۔ آخر الذکر دونوں حضرات ہجرت فرما کر کربلائے معلی میں مقیم رہے اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہوئے۔ اب بھی مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ المدعو بہ جناب کبن صاحب (خلف الصدق فردوس مکان جناب مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ) اور مولانا سید عبد المہدی صاحب اور مولانا سید محمد مہدی صاحب (فرزندان جناب مولانا سید کلب باقر صاحب قبلہ قدس اللہ سرہ) اس عصر کے مجتہدین عظام اور علماء کرام کے زمرے میں داخل ہیں۔ سلمہم اللہ تعالےٰ۔

یاد ہیں، یہاں صرف اُنہی باتوں کا ذکر کروں گا جن کا کسی نہ کسی طرح شاعری سے تعلق ہے۔

میرے بڑے بھائی جناب مولوی سیّد کلب حیدر صاحب کے درس میں فارسی کی کچھ کتابیں تھیں، مجھے خوب یاد ہے کہ اُن کے سبق کے جو اشعار میرے کانوں تک پہنچ جاتے وہ حافظے میں باقی رہتے تھے حالانکہ نہ صرف فارسی زبان سے میں اُس وقت بے بہرہ تھا بلکہ حرف شناس بھی نہ تھا یوں ہی اگر کوئی شعر ناموزوں پڑھا جاتا تو سامعہ فوراً ناموزونی کو محسوس کر لیتا تھا حالانکہ عروض سے اُس زمانے میں مجھے کوئی واسطہ نہ تھا۔

تعلیم بارے پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی گھر پر کچھ مذہبی کچھ درسی کتابیں پڑھ کر مدرسۂ سرکاری میں داخل ہوا۔ تحصیل بانس گاؤں ضلع گورکھپور اور پھر قصبہ جائس ضلع رائے بریلی کے مدارس اُردو میں اتنے درجے طے ہو چکے تھے کہ کاسگنج (ضلع ایٹہ) پہنچ کر بھی، جہاں انگریزی مدرسہ موجود تھا، آخری جماعتوں کی تعلیم کے لئے اُردو ہی کے مدرسے میں داخل ہونا پڑا۔ اُردو کا مڈل پاس کیا۔ اب میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھی۔ لیکن انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

آغازِ شاعری

ہم سبق طلبہ یا مدرسین میں سے کوئی صاحب شعر و شاعری کا کچھ چرچا کرتے تو میں لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک روز کا سگنج کے مدرسۂ اُردو میں کسی صاحب نے ایک مصرع پڑھا "آتے آتے طشت تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے" اور فرمانے لگے کہ اس پر مصرع نہیں لگ سکتا۔ مجھے تعجب ہوا، ایک مصرع میں نے کہا اور ڈرتے ڈرتے سُنایا:۔

"آبِ نیساں کیا ہے، یاں ہر قطرہ میرے اشک کا
آتے آتے طشت تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے"

سُننے والوں نے حوصلہ افزائی کی، میں نے غزل کہہ ڈالی جس کا ایک ہی شعر اور یاد رہ گیا ہے:۔

"میرے نالوں کا اثر ہے ورنہ کیا ممکن ہے یہ
غیر کا کوچے میں اُس کے گھر بنے اور ٹوٹ جائے"

گھر میں کبھی کبھی امام مظلوم حضرتِ سید الشہدا علیہ آلاف التحیہ والثنا کی مجالس عزا ہوتی تھیں۔ میر انیس صاحب، میرزا دبیر صاحب اور دوسرے بزرگوں کا کلام از قسم رباعی و مخمس، مرثیہ و سلام پڑھا جاتا تھا، میرے جی میں آیا کہ میر صاحب کے ایک سلام کو خمسہ کروں جس کا مطلع یہ ہے:۔

"مجرئیؔ صدقے ہوں اُس درگاہ پر
فوق ہے جس کے گدا کو شاہ پر"

خمسہ[1] کیا اور لکھ لیا، مجلس ہوئی تو پڑھا، والد ماجد مدظلہٗ نے بھی سماعت فرمایا اور خوش ہوئے۔

کاسگنج میں کچھ شعراء بھی تھے، مشاعرے بھی ہوتے تھے، مشاعرے میں شرکت کی اجازت مجھے نہ تھی، لیکن مجھے اگر طرح معلوم ہو جاتی تو

---

[1] یہ خمسہ نہ میرے پاس لکھا ہوا رہ گیا نہ مجھے یاد تھا، ایک بار محرم میں وطن جانا ہوا تو وہاں میرے بھانجے سید نجات علی سلمہٗ اللہ نے جس کی عمر اس وقت چھ سال سے زیادہ نہ تھی، مجلس میں سرِ ممبر کہا کہ "میر انیس صاحب کا سلام ہے، ماموں جان نے مصرعے فرمائے ہیں"۔ میں متعجب ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا، بچے نے پڑھا تو یہ سلام تھا اور اس پر میری تخمیس۔ پھر اس کا تصنیف کرنا مجھے بھی یاد آ گیا، صورت یہ ہوئی تھی کہ میں نے مجلس میں پڑھنے کے بعد کہیں رکھ دیا اور بھول گیا، میری بہن مرحومہ کو ملا، اُنھوں نے حفاظت سے رکھ لیا۔ برسوں بلکہ جگوں کے بعد جب یہ بچہ مجلس میں پڑھنے کے قابل ہوا تو اُسے تعلیم دی اور میرے علم میں لائے بغیر، میری موجودگی میں اچانک پڑھنے کی ہدایت کر دی۔ یہ محرم ۱۳۴۹ھ کا واقعہ ہے، آہ ۱۳۵۰ھ میں وہ بہن نہ تھی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

میں غزل ضرور کہتا تھا۔

شاعری کا دوسرا دور

یہ زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ برس کی عمر تک کے واقعات ہیں، اس کے بعد بھی سلسلہ یونہی جاری رہا۔ والد ماجد مدظلہ کا تبادلہ ایٹہ کو ہوگیا، ایٹہ اور مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں مشاعرے ہوتے تھے، کبھی کبھی خدا بخشے میر مظفر حسین صاحب آیما کی سفارش سے مجھے بھی شرکت کا ایما ہو جاتا تھا۔ بہر حال فطرت تو متقاضی تھی ہی، حالات نے بھی کچھ اعانت کی ستمبر ۱۹۱۹ء تک شاعری کی ہوا ایک خاص رُخ چلتی رہی۔

شاعری کا تیسرا دور

آخر ایک روداد نے حالات میں ایک تغیّر عظیم پیدا کر دیا، ڈیڑھ ہی سال کی مدت اور گزری تھی کہ مئی ۱۹۲۱ء میں رفیقۂ حیات نے بیس[1] سال کا ساتھ چھوڑا، دنیا و مافیہا سے دل پھیکا ہو گیا، اس کے بعد شاعری میں جو تدریجی تغیرات رونما ہوتے رہے وہ مطالعۂ کلام سے شائد اچھی طرح ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ترکِ تعلیم و کتب بینی

شاعری اور شاعری کے معین حوادث کی بدولت پندرہ سولہ سال کی عمر سے درس و تدریس کا شغل ایسا چھوٹا اور طبیعت ایسی اُچاٹ ہوئی کہ پھر کبھی کسی کتاب

---

[1] شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔

میں اچھی سے اچھی کتاب میں دل نہ لگا۔ انتہا یہ ہے کہ بہترین شعرا کے دیوان اور دلچسپ ترین افسانوں کا مطالعہ بھی ممکن نہیں۔ کبھی احبابِ خاص جو میری اور کتابوں کی اَن بَن سے خوب واقف ہیں، اگر کسی کتاب کے مطالعے کی بہت ہی سفارش کرتے ہیں تو دو چار صفحے سے زیادہ دیکھنے پر قدرت نہیں پاتا، اور پھر اُس کتاب کے متعلق اُن احباب کے سوالات کا جواب اک ندامت آمیز تبسم کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

یہ صورت ہے اُن کتابوں کی جن کا موضوع میرے ذوق فطری کے موافق کہا جاسکتا ہے۔ وائے برحال اُن کے جو مدارس انگریزی کے مختلف درجوں کے نصاب میں داخل ہیں اور جن کا پڑھنا فرض کے طور پر طالب علم کے ذمّے عائد ہوتا ہے چاہے وہ اُس غریب کے لئے کیسی ہی غیر دلچسپ کیوں نہ ہوں۔ بہر نوع نتیجہ یہ ہوا کہ میری تعلیم ہر اعتبار سے ناکمل رہی اور گویا جاہلِ محض ہوں، نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہ کوئی دستارِ فضیلت۔

معیشت ثروتِ خاندانی کا حال پہلے ہی لکھ چکا ہوں، یوں میرے لئے معاش کا ذریعہ وہی پیشِ پا افتادہ مضمون ٹھہرا، یعنی ملازمت کوئی بیس برس کی عمر سے نوکری شروع کی، تین برس ملیح آباد میں، اور تقریباً اتنے ہی دنوں پورنیہ میں رہا، پھر تخمیناً سال بھر کا زمانہ گھر پر بیکار ہی میں بسر کرنے کے بعد اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء میں ریاست بھوپال کے ایک محکمے میں ہیڈ

کلرک مقرر ہؤا اور زہے استقلال کہ نو سال تک اِسی عہدے پر مامور رہا۔ ۱۹۲۲ء میں ریاست نے لیجسلیٹو کونسل کا افتتاح کرنا چاہا اور دفتر میں بہ حیثیت نگراں (آفس سپرنٹنڈنٹ) میرا تقرر عمل میں آیا۔ سال بھر کے بعد وہ محکمہ ایک دوسرے محکمے میں مل گیا اور میری جگہ تخفیف میں آ گئی۔

اب تو مجھے صدہا واقعات ایسے یاد آتے ہیں کہ تقدیر نے میرے خلاف مرضی جو صورت پیش کی اُس کا مآل بہت خوش آیند تھا، لیکن یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو دس سال کی مستقل ملازمت کے بعد جگہ کا تخفیف ہو جانا میرے لئے تردد خیز واقعہ تھا، خصوصاً اِس سبب سے کہ میں ایک سال پہلے عقدِ ثانی کر چکا تھا۔ خیر، الحمد للہ بگزشت۔

تخفیف شدگان کے لئے جو احکام ریاست کے تھے، اُن کی تعظیم ارباب حل و عقد پر واجب سمجھتے ہوئے، میں کچھ دنوں اِس کا متوقع رہا کہ مجھے بھی کوئی مناسب جگہ مل جائے گی، لیکن یہ دیکھ کر کہ متعدد حضرات، حکومت کے اِن احکام کو قصۂ پارینہ اور دفترِ بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، مایوسی ہوئی۔ زیادہ انتظار امکان میں نہ تھا، دسمبر ۱۹۲۳ء میں پنشن کی درخواست دے کر حبیبی ضیاءِ عباس صاحب ہاشمی بدایونی کی تحریک سے گوالیار چلا آیا۔

حبیب موصوف کی محبت کا ذکر میں احسان کے نام سے نہیں کرنا

چاہتا کہ یقیناً یہ عنوانِ بیان اُن کے خلوص و مودت کی توہین کا مرادف ہے
بہرحال سرکارِ گوالیار کی درس گاہِ صنعت و حرفت (ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ) میں
ایک شعبے کی نگرانی پر مامور رہا۔

کلکتے کا ایک سفر اور مشاعرہ

تقریباً سال بھر کام کیا تھا کہ ریاست کی
ایک ضرورت سے کلکتے جانا پڑا۔ نصیر الممالک محتشم الملک خان
بہادر میرزا شجاعت علی بیگ قونسل جنرل
ایران (مرحوم) کو میرے وردو کی اطلاع ہوئی، اُنھوں نے اپنے یہاں مشاعرے
میں شرکت کی دعوت دی جو ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو منعقد ہونے والا تھا۔
۹ مارچ کو دعوت ملی، میں نے وعدہ کرلیا، شریک ہوا اور طرح کی غزل
پڑھی۔ جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:-

تجھے اے قیس اک جلوہ نظر آتا تو ہے دل میں
پھر اب کیا بحث، لیلےٰ گھر میں بیٹھی ہو کہ محمل میں
مری ہر سانس گویا ایک گامِ سعی ہے مانیؔ
یہ میں جیتا نہیں، مصروف ہوں قطعِ منازل میں"

چونکہ میں اُس غریب نوازی کا ذکر واجب سمجھتا ہوں جس کے جلوے مجھے
احبابِ کلکتہ کے دامنِ اخلاق میں نظر آئے اور مبسوط دیباچہ لکھ ہی رہا ہوں
اس لئے اک ذرا تفصیل سے قیامِ کلکتہ کے حالات بیان کروں گا۔

مشاعرے میں میری موجودگی کا علم خان بہادر نصیر الممالک اور ابو جعفر صاحب کشفی انسپکٹر مدارس کے سوا کسی کو نہ تھا۔ نہ مجھے کسی کی خدمت میں تعارف کی عزت حاصل تھی۔ ایک موقع پر کشفی صاحب نے میرے تخلص سے مجھے مخاطب فرمایا تو حکیم ناطق صاحب لکھنوی، آغا شاعر صاحب دہلوی، خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت اور دوسرے شرکاء مشاعرہ کو میری موجودگی معلوم ہوئی، پھر تو مشاعرے میں بھی بہت لطف رہا اور بعد مشاعرہ بھی بڑی دلچسپ صحبتیں رہیں۔ کبھی حکیم ناطق صاحب کے یہاں، کبھی وحشت صاحب کے یہاں، کبھی نصیر الممالک مرحوم کے یہاں؛ کبھی اسلامیہ عربک کالج میں۔ غرض فرصت عنقا اور روشنی طبع بلا ہو گئی نواب نصیر حسین خانصاحب خیال نے بھی مدعو فرمایا لیکن میں معذور رہا کہ وقت نہ مل سکا۔

موجودہ ملازمت کی شان نزول

اسی اثناء میں (۲۴ یا ۲۵ تاریخ مارچ کی ہوگی) آگرے سے حبیبی لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کا خط ملا، جس میں انھوں نے بسوندہ جناب سید آل نبی صاحب مغفور بلدیہ آگرہ کی ٹکس سپرنٹنڈنٹی منظور کرنے کے لئے میرا استمزاج کیا تھا۔ کلکتے میں ریاست کا جو کام تھا اُس سے بھی فرصت ہو چکی تھی، میں براہ آگرہ گوالیار کو واپس ہوا۔ آگرے میں سید صاحب ممدوح (صدر بلدیہ) سے ملاقات ہوئی، مصر ہوئے کہ گوالیار جا کر جلد سے جلد آگرے

واپس آؤں لیکن کئی مہینوں تک اپنے کو تعمیل سے قاصر اور اُن کے تقاضے کو جاری دیکھ کر، آخر میں نے معذوری ظاہر کی اور انکار کر دیا۔ پھر خط پہنچا کہ "جب تک نہ آؤگے انتظار کیا جائیگا" اب ہیں کفرانِ نعمت کی پاداش سے ڈرا، جلد کوشش کر کے، ۱۲ مئی ۱۹۲۵ء کو آگرے پہنچا اور ۱۵۔ مئی ۱۹۲۵ء سے موجودہ عہدے کا کام شروع کر دیا۔ اس عہدے کے کاموں کی نوعیت اور کثرت، اور اِن کے ہوتے ہوئے فکرِ سخن یا دوسرے ادبی مشاغل کی فرصت، بعد المشرقین کی تفسیر ہے۔

رسالۂ تسنیم کی ادارت

اتفاق سے کچھ دنوں بعد محبی جناب فانی بدایونی وارد آگرہ ہوئے۔ کبھی کبھی شعر سننے سنانے کا لطف رہنے لگا، جنوری ۱۹۳۱ء میں رسالۂ تسنیم جاری ہوا جس کی ادارت میں مجھے بھی فانی صاحب اور مخمور صاحب کی شرکت کرنی پڑی دسمبر ۱۹۳۱ء سے دونوں حضرات تو دست کش ہو گئے اور قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔

ارباب ذوق اور اہلِ بصیرت کافی حوصلہ افزائی تسنیم کی فرما رہے ہیں اور تسنیم بھی دل کھول کر ادبی خدمات بجا لا رہا ہے

یہ ہے میرا ماضی و حال، مستقبل کا علم خدا کو ہے۔ لہٰذا ہر تو،

دم واپسیں برسرِ راہ ہے بس اب یارو اللہ ہی اللہ ہے

آگرہ۔ جون ۱۹۳۲ء
مطابق صفر ۱۳۵۱ء

عبد مذنب سید کلب احمد مانی جائسی

غزلوں کی فہرست

غزل کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرعِ اولےٰ	صفحہ	تعداد اشعار

نظموں کی فہرست

شمار	عنوان	صفحہ	تعداد اشعار

نظموں کی فہرست

نظموں کی فہرست

خمسوں کی فہرست

کلام متفرق کی فہرست

بسمہ سبحانہ

۱۔ فلسفۂ عشق

دسمبر ۱۹۱۲ء

ہے عشق اک سودائے سر، یا کاہشِ روح درواں
یا لذتِ دردِ جگر، یا حسرتِ آرامِ جاں
مجموعۂ آلام ہے، سوزِ دلِ ناکام ہے
یا موت کا پیغام ہے، یا ہے بلائے جاں ستاں
اک نکتہ ہے اک راز ہے، رمزِ نیاز و ناز ہے
یا یہ کہوں اعجاز ہے، جو دل سے ہوتا ہے عیاں
یہ ناوکِ صیاد ہے، یہ نشترِ فصاد ہے
یہ خنجرِ جلاد ہے، یہ اک فنا کا ہے نشاں

یہ باغ میں گل ریز ہے، صحرا میں وحشت خیز ہے
دل میں الم انگیز ہے، سر میں جنوں کا رازداں
آنکھوں میں ہے یہ اشکِ خوں، سینے میں ہے سوزِ دروں
ماتھے میں بختِ واژگوں، ہونٹوں پہ آہوں کا دھواں
نیرنگیوں میں فرد ہے، چہرے پہ رنگِ زرد ہے
بر میں دِل پر درد ہے، تن میں ہے جانِ ناتواں
بے خوف ہے، بے باک ہے، بے رحم ہے سفاک ہے
ایسا یہ اک فتراک ہے، ممکن نہیں جس سے اماں
ایمائے چشمِ پر جفا، خونِ شہیدانِ دفا
آئینِ اربابِ صفا، طرزِ ستم ہائے بتاں
ہے نجد میں دشتِ جنوں، فارس میں کوہِ بے ستوں
لیلےٰ کی آنکھوں کا فسوں، شیریں کا حسنِ بے اماں
یہ جلوۂ جانانہ ہے، یہ دشمنِ بیگانہ ہے
دل اس کا خلوت خانہ ہے، یہ دل میں رہتا ہے نہاں

وہ دل جو ہے آئینۂ اسرارِ نہاں دعیاں

وہ دل جو ہے گنجینۂ رازِ وجودِ دو جہاں

ہاں رہروِ راہ فنا، ہاں کشتۂ تیغ وفا،

ہاں میرے پیارے دل بتا، اس کی قیامت خیزیاں

منظر بلا انگیز وہ بھولا نہ ہوگا تو ابھی

یعنی ہوا جب عشق آکر آہ تیرا میہماں

ہنگامۂ محشر تھا یا ساماں دردِ عشق کا

میری نظر میں پھر رہا ہے وہ تلاطم کا سماں

دامن اِدھر وحشت نے میرا پرزے پرزے کردیا

میں نے اُدھر دامانِ صحرا کی اُڑا دیں دھجیاں

کیسی قیامت کی تپش سینے میں پیدا ہوگئی

کس درد سے دیوانہ ساں کی میں نے رو رو کر فغاں

میں اِس طرف یوں مضطرب تھا اُس طرف نالے مرے

ہونٹوں تک آ پہنچے کہ نکلیں اور ہلا دیں آسماں

اُس وقت راہِ عشق سے میں بھی تھا یک سر نابلد
اور تیرا ثانی الذہن بھی تھا مطلقاً مجھ سے نہاں
اب عشق کے آثار سے کچھ میں بھی واقف ہو گیا
تجھ کو جو ربطِ خاص اس سے ہے، ہوا وہ بھی عیاں
یہ تو وہی سیلاب ہے لے غرقِ امواجِ بلا
خون کی جگہہ تیری رگوں میں جو ازل سے ہے رواں
سمجھا میں اب اے میرے جلتے دل، یہ وہ سوزش ہے جو
پتھر کے شعلے کی طرح، باطن میں تیرے تھی نہاں
سچ تو یہ ہے عشق ایک ایسا دردِ لطف انگیز ہے
بے اس کے بالکل ہیچ ہے، گر ہو حیاتِ جاوداں
جس کو بنالے یہ اسیر اپنا، ہوا آزاد وہ
ممکن نہیں پھر ہو کبھی قیدیِ غم ہائے جہاں
رازِ ظہورِ انبیا، سرِ وجودِ قدسیاں،
المختصر ہے وجہِ تخلیقِ زمین و آسماں

۲۔ کارنامۂ حسن

جون ۱۹۱۳ء

ہے فلک پر قدرتِ باری کے، یوں نورفشاں اک ماہ مبیں
کہ منور سرتاسر جس سے، مخلوق خدا کے دل کی زمیں
کور اُس کو بدِ بیضا سمجھا، بیمار اُسے عیسیٰ سمجھا
مجنوں نے اُسے لیلیٰ سمجھا، فرہاد اُسے سمجھا شیریں
وامق نے اُسے عذرا سمجھا، ہاروت اُسے زہرہ سمجھا
موسیٰ نے نہ جانے کیا سمجھا، غش ہو کے گرے سرِ طورِ بریں
جانا ہے کسی نے اُس کو صنم، سمجھا ہے کوئی قندیلِ حرم
برقِ خاطف کہتے ہیں ہم، جس کی ہمیں تاب دید نہیں
رندوں کے لئے ہے جام و سبو، آہو کے لئے سبزے کا نمو
قمری کے لئے سروِ دل جو، بلبل کے لئے ہے گلِ رنگیں
اک جا گہرِ پر آبِ وفا، اک جا نورِ دلِ اہلِ صفا
اک جا تیغِ پر خونِ جفا، اک جا شکنِ بالائے جبیں

کہیں زلفِ پری، کہیں ناگن ہے، کہیں چشمِ آہوئے پرفن ہے
کہیں باغ میں لالۂ وسوسن ہے، کہیں زینتِ دامانِ گل چیں
کہیں نرگس چشم کہیں گل رو، کہیں غنچہ دہن کہیں سنبل مو
کہیں شعبدہ گر، کہیں عربدہ جو، کہیں حور لقا، کہیں ماہ جبیں
کہیں غازۂ روئے زیبا ہے، کہیں روح و روانِ تمنا ہے
کہیں راحتِ جانِ زلیخا ہے، کہیں ملکِ مصر میں تخت نشیں
کبھی محسودِ ابنائے زماں، کبھی نوردہ چاہِ کنعاں
کبھی روشنی کنجِ زنداں، کبھی شمعِ ہدایتِ راہِ یقیں
کبھی مایۂ ناز و تعلّی ہے، کبھی مضطرِ دل کی تسلّی ہے
کبھی پرتوِ برقِ تجلّی ہے، کبھی جلوہ فروزِ عرشِ بریں
کبھی صحرا گردوں کا مہماں، کبھی زیب دہِ قصرِ سلطاں
کبھی شیر افگن کا بلائے جاں، کبھی تاجِ شاہ کا درِّ ثمیں،
گہہ دامِ پئے مرغِ دل ہے، گہہ محوِ نظارۂ بسمل ہے
گہہ صید فگن گہہ قاتل ہے، گہہ تیرِ قضا، گہہ خنجرِ کیں

گہ باعثِ الفتِ واثق ہے، گہ مقصدِ جذبِ صادق ہے
گہ سوزشِ قلبِ عاشق ہے، گہ دردِ دلِ شیدائے حزیں
یہ مطلب ہر اہلِ دل ہے، یہ مرادِ فردِ کامل ہے
زاہد بھی اسی پر مائل ہے، یعنی ہے طالبِ حورالعیں
یہ حسن، یہ اک روشن تو ہے، نظارہ سوز و پرضو ہے
مگر اس کا نور اک پرتو ہے، یعنی روشن بالذات نہیں
ہاں جس سے ہے روشن نام اس کا، جس سے ہے یہ شہرہ عام اس کا
یوں جس سے بڑھا اکرام اس کا، وہ عشق ہے اور اس کا آئیں
اے عشق اے ثابتِ رخشندہ، اے جوہرِ محض اے نورِ مبیں
تو شمسِ نظامِ قدرت ہے، یہ حسن اگر ہے ماہ مبیں
تیرے فیض سے حسن کے جلوے ایسے کچھ مشہود ہوئے
آخر اس کو جوہر سمجھے جہاں کے اکثر ظاہر بیں
اربابِ دلِ واقف ہیں مگر، یہ حسن عرض ہے تو جوہر
آتا نہ کسی کو حسن نظر، گر تیری ضیا ہوتی نہ معیں

اوصاف اپنے اے عشق سُنے، اب ایک شکایت بھی سُن لے
ایسی کہ جواب اُس کا تجھ سے، ممکن ہی نہیں، ممکن ہی نہیں

وہ حُسن نوازی کی تو نے، وہ حُسن کو عزّت دی تو نے
وہ شان اِسے بخشی تو نے، وہ ناز سہے وہ جفائیں سہیں

کہ بنا یہ بانیِ جور و جفا، اور موجدِ غمزۂ و ناز و ادا،
ہوا ممتحنِ تسلیم و رضا، وہ اس کی سادگیاں نہ رہیں

وہ طرزِ ستم اسے یاد ہوئے، کہ ہزاروں دل ناشاد ہوئے
ارمان بہت برباد ہوئے، بہت آرزوئیں پامال ہوئیں

آ- تجھ کو دکھاؤں ایک سماں، اک حالِ پراندوہ و حزیں
عجب ایک قیامت کا ساماں، واللہ عجب منظر خونیں

وہ مریض جو بسترِ غم پہ ہے، کیا دُکھ بے چارے کے دم پہ ہے
حسرت کی نظر کبھی ہم پہ ہے، کبھی سوئے فلک کبھی سوئے زمیں

پڑے رونے اُس کے نصیبوں کے، نبضوں پہ ہاتھ طبیبوں کے
نالے ہیں لبوں پہ غریبوں کے، یوں جمع عزیز سرِ بالیں

ہیں نبضیں ساقط، حالِ دگر، نہ دوا کا عمل، نہ دُعا کا اثر
مہمان ہے دُنیا کا دم بھر، تر ہے عرقِ آخر سے جبیں
جب یاس کا دریا چڑھتا ہے، حسرت کا تلاطم بڑھتا ہے
یہ میر کا مطلع پڑھتا ہے، با چشمِ پُرآب و صدائے حزیں
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریِ دِل نے آخر کام تمام کیا

۳۔ رازِ بقا

اکتوبر ۱۹۱۳ء

منظرِ دنیائے فانی ہے تماشائے سراب — اہلِ بینش جانتے ہیں اس کے نظارے کو خواب
ڈوبتے ہیں رات دن کتنے جہازِ زندگی — وقتِ غرق آیا اِدھر ٹوٹی اُدھر اُن کی طناب
موجۂ بادِ فنا نے کر دیا برباد اُسے — بحرِ ہستی میں کوئی اُبھرا جو مانندِ حباب
کیا ہوا رشکِ ارسطو ہے جو کوئی عقل میں — کیا ہوا گر فلسفے میں ہے فلاطوں کا جواب
کیا نتیجہ پھر، اگر کوئی ہے یوسف سا حسیں — نفع کیا، گر ہے کسی کو گنجِ قاروں دستیاب
چاہیے کوئی حسن میں یکتا ہو یا دولت میں فرد — عقل میں بے مثل ہو یا فلسفے میں انتخاب

آخرِ کار ایک دن ہونا ہے اِن سب کو فنا ۔ ذرہ ذرہ جسم کا ہو جائے گا جزوِ تراب
کب تک آنکھیں بند اے مانی ذرا ہشیار ہو ۔ دیکھ چشمِ دل سے دُنیائے دنی کے انقلاب

"پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب"

۴۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۱۴ء

لب ہلیں شکرِ مسیحا میں یہ دم بھی نہ رہا ۔ ضعف یہ ہے کہ سرِ بارِ کرم بھی نہ رہا
چارہ سازی تو مناسب ہے، مگر یاد رہے ۔ نہ رہا درد اگر دل میں تو دم بھی نہ رہا
سر پھرا ہے، گلۂ برہنہ پائی کیوں ہے ۔ تاجِ اسکندر و کیخسرو و جم بھی نہ رہا

قطعہ

ایک دل سوز نے پوچھا کہ "نہیں روتے آپ ۔ شاد اب ہو جب زاری کو کوئی غم بھی نہ رہا"
میں نے کی عرض یہ سچ ہے نہیں بہتے آنسو ۔ مگر اس سے نہ سمجھئے کہ الم بھی نہ رہا
گریہ کیا ہے، اثرِ جوششِ خونِ دل ہے ۔ خونِ دل ہی نہ رہا، آنکھ میں نم بھی نہ رہا

لے نامعلوم

نہ سہی خیر، سکونِ دلِ آنی کا خیال
سخت جانی! تجھے پاسِ شبِ غم بھی نہ رہا

۵۔ سوگوارِ آرزو

مارچ سنہ ۱۹۱۴ء

مطمئن رہیئے کہ اب جینا مرا ممکن نہیں — صورتِ تسکینِ جانِ مبتلا ممکن نہیں
آپ سے ایفائے پیمانِ وفا ممکن نہیں — چارہ سازیِ دلِ دردآشنا ممکن نہیں

اب مری حسرت غمِ جاں کاہ کی تمہید ہے
آہ، اک حسرت زدہ کی موت اس کی عید ہے

یوں ہی جیتے جی رہے گی جب مجھے فرقت نصیب — زندگی میں خاک ہو سکتی ہے پھر راحت نصیب
تھا مزا جینے کا، ہوتی دید کی دولت نصیب — کیا جیا، گر یوں جیا بھی آہ میں حسرت نصیب

میرے ارماں گھٹ کے ظلمت خانۂ دل میں رہے
شمعِ بزم افروز بن کر آپ محفل میں رہے

وائے حسرت، مٹ گئے سب میرے ارمانِ عزیز — لُٹ گیا افسوس، امیدوں کا سامانِ عزیز
چل بسی دل سے تمنا جیسی مہمانِ عزیز — سوچیے تو کیوں نہ کھو بیٹھے گا وہ جانِ عزیز

دے گئی ہو آہ، جس کو رنج بے حد آرزو
جس کے سینے میں بپا ہو ماتم عہد آرزو

تھی غرض اللہ مجھ پر راحتِ دنیا حرام
کشمکش ہائے الم میں زیست کٹتی تھی مدام
یاس آخر دائمی آرام کا لائی پیام
منتظر ہے موت اب کہتا ہوں رخصت والسلام

بس خدا حافظ، چلا ناکامگارِ زندگی
ہو مبارک آپ کو عیشِ بہارِ زندگی

دفن ہو اے رنج ہجر، اے یادِ ایامِ وصال
اے تمناؤ نہ دو اب مجھ کو پیغامِ وصال
دل میں چبھ جاتا ہے نشتر کی طرح نامِ وصال
صبحِ محشر کو سمجھ لو اب مری شامِ وصال

کام اپنا کر لیا ہے زہرِ غم کے جام نے
اے تصور عیش کی صورت نہ آئے سامنے

کچھ نہیں تجھ کو بھی پایا بے اثر اے جذبِ عشق
نزع میں آئے نہ وہ بالیں پر اے جذبِ عشق
میں تو اب کرتا ہوں دنیا سے سفر اے جذبِ عشق
ہو سکے تجھ سے تو اتنا کام کر اے جذبِ عشق

اُن کو دے آمزدۂ عیش و سرورِ جاوداں
کھینچ دے اس بے کسی کی موت کا جا کر سماں

یہ خبر سن کر اگر شائندہ ظاہر غم کریں   یا ذرا رنجیدہ ہو کر اپنی آنکھیں نم کریں
تو یہ کہنا "آپ رنجِ مرگِ ثانی کم کریں   آپ کے دشمن ہوں آزردہ، یوں ماتم کریں

آپ کو اللہ رکھے کامگارِ آرزو
کیا ہوا اگر مر گیا اک سوگوارِ آرزو"

اب عبث ہے یہ تأسف اور یہ اظہارِ غم   جا چکا دارِ فنا سے آپ کا بیمارِ غم
ایک جانِ ناتواں سے کیونکر اٹھتا بارِ غم   موت کا پیغام تھا کم بخت یہ آزارِ غم

تھک گئے تدبیر کرتے کرتے چارہ گر طبیب
مرنے والے کو نہ لیکن ہو سکی صحت نصیب

زندگی بھر یوں تو اُس نے یہ دکھ پایا بہت   ضبطِ غم کی سعیِ لایعنی میں غم کھایا بہت
حسرتِ دیدار نے آخر جو تڑپایا بہت   میں نے دی تسکیں، یہ کہہ کے سمجھایا بہت

آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمنِ جانِ فراق
اک نہ اک دن چاک رکھا ہے گریبانِ فراق

تھا مگر بدبخت کی تقدیر میں مٹنا لکھا   کھیلتی تھی اُس شکارِ موت کے سر پر قضا
کیا کہوں بس ہو چکی بدقسمتی کی انتہا   میرا سمجھانا بھی بالکل بے اثر ثابت ہوا

اُٹھ گیا دُنیا سے وہ، افسانۂ غم رہ گیا
آہ لیکن مرتے مرتے آپ سے یہ کہہ گیا

اے سرورِ جاں، مرادِ زندگی آرامِ دل — مطلقاً ناقابلِ برداشت ہیں آلامِ دل
زہرِ غم سے ہو چکا لبریز یعنی جامِ دل — ایسی حالت میں اگر مر جاؤں میں ناکامِ دل
تو سمجھنا ایک جنسِ بے حقیقت کھو گئی
یا کوئی بلبل گُلِ عارض پہ صدقے ہو گئی

واقعی میری حقیقت کیا ہے میرا کیا شمار — میری جیسی لاکھ جانیں تیرے قدموں پہ نثار
رہتی دُنیا تک رکھے تجھ کو سلامت کردگار — آئے باغِ زندگی میں کامرانی کی بہار
عشق جب تک واردِ دنیا ہے قدر افزائے حسن
تو رہے با صد غرور و ناز بزم آرائے حسن

رنج کاہے کا یہی ہوتا ہے الفت کا مآل — ہو گیا ہے فرقتِ جاناں میں مجنوں کا وصال
خبر میری موت سے تجھ کو خوشی ہو یا ملال — لیکن اک میری وصیت ہے رہے اُس کا خیال
خیر سے اللہ بخشے جب تجھے تیری مراد
دل سے میری نامرادی کی نہ بھولے تجھ کو یاد

اس سے پہلے ہاں یہ کہنا تھا کہ اے جانِ جہاں — تجھ کو گر مانع نہ ہو پندارِ حسن بے اماں
میری میت پر چلے آنا بہ نازِ جاں ستاں — ساتھ چل کر دیکھ لینا پھر یہ عبرت کا سماں

بائیں پہلو میں مرے ہوگا مزارِ آرزو
دفن ہوں گا اس طرح میں سوگوارِ آرزو

۶۔ غزل

مارچ سنہ ۱۹۱۴ء

اللہ اللہ یہ تکلف بہر مہمانِ فراق — بادۂ خونِ جگر ہے زینتِ خوانِ فراق
آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمنِ جانِ فراق — اک نہ اک دن چاک رکھا ہے گریبانِ فراق
نالۂ سوزاں کی شمعیں داغ ہائے دل کے پھول — دید کے قابل ہے، سامانِ شبستانِ فراق
خونِ دل سے میں نے جس کی یاد میں سینچا اسے — کاش وہ بھی دیکھتا سیرِ خیابانِ فراق
کاٹ دے مشکل مری تیغِ تمنائے وصال — میں نہ لوں گا اپنے سر پر بارِ احسانِ فراق
گوشِ دل سے سُن شہیدانِ محبت کی صدا — مبدءِ عمرِ ابد ہوتا ہے پایانِ فراق
بھیس آہوں کا بدل کر نکلی ہیں آہیں نہیں — حسرتیں ہیں جادہ پیمائے بیابانِ فراق
جانے والے آہ ناقے پر ترے محمل بندھا — یا اسی محمل کے پردے میں ہے سامانِ فراق

جی اُمیدِ وصل پر مانی، خوشی ہے غم کے بعد
صبر کرو مٹ جائے گا یہ دور دورانِ فراق

۷۔ تخمیس

(بر قطعہ حضرت غالب مغفور)

اپریل ۱۹۱۴ء

اے غلغلانہ شیفتگانِ ادائے دل — اے جاہلانہ معتقدانِ بقائے دل
اے جاں نہادگاں بسرِ نقشِ پائے دل — اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

لازم ہے یہ کہ زیرِ قدم ایسی راہ ہو — منزلِ نجات جس کی ہو، مقصد پناہ ہو
کیوں لطفِ عارضی کے لئے یوں تباہ ہو — دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

مانا کہ تاج و تخت سہی سلطنت سہی — ہے اور بھی عدوئے خرد عشرتِ شہی
یعنی وہاں تو اتنی سمجھ بھی نہیں رہی — ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

عبرت کی روئداد ہے اک محفلِ نشاط — پروانے اور شمع کا باہم وہ اختلاط
دورِ سبو، وہ فورِ گل و جوشِ انبساط — یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ تھا بساط

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

میں کیا بتاؤں محفلِ عشرت کا تھا جو رنگ — زینت فزا تھے صد حسینانِ شوخ و شنگ
محوِ نظارہ مجمعِ عشاق بے درنگ — لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ہر سو غرض کہ چھائی ہوئی تھیں مسرتیں — وہ بزم تھی کہ زاہد و واعظ جو دیکھ لیں
بے اختیار بزمِ جہاں سے مثال دیں — یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں

نہ وہ سرور و شور، نہ جوشِ خروش ہے

وہ عیش مٹ گیا وہ مسرت فنا ہوئی — گل ہے نہ مُل، نہ ساقی و مطرب کی دل لگی
ہاں یادگارِ عشرتِ بزمِ شبینہ کی — داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

۸- غزل

اپریل ۱۹۱۴ء

خامشی، اچھا ہے شیوہ پیکرِ تصویر کا — یعنی کیا کہنا کسی کی شوخیِ تحریر کا

لطف کھویا اشک نے نظارۂ تحریر کا
دیکھتا ہوں آنکھ سے لکھا ہوا تقدیر کا

رونق بازار سودا عقدۂ گیسو ترا
زینتِ بزمِ جنوں حلقہ مری زنجیر کا

دستِ وحشت سے نہ بچتا دامنِ دشتِ جنوں
آگیا ہے پیچ میں لیکن قدم زنجیر کا

اور ساماں تو نہیں اب قبرِ مجنوں پر مگر
نغمہ پردازِ جنوں ہے غل مری زنجیر کا

کیا غضب ہے کوہکن کو حسرتِ شیریں رہی
اور شیریں کو رہا ارمان جوئے شیر کا

بختِ وحشت آشنا کا بل ہے آئی وہی
نفع کیا ہے میرے پاؤں میں خمِ زنجیر کا

۹ پیامِ بیمار

فروری سنہ ۱۹۱۵ء

برابر ہوتے ہیں ساعت بہ ساعت غش پہ غش طاری
گزرتی ہیں ترے عاشق پہ فرقت کی شبیں بھاری

جو کچھ فصل ایک غش سے دوسرے کو ہو بھی جاتا ہے
تو اتنی دیر تک رہتا ہے محوِ گریہ و زاری

زمانے بھر میں جس کا چارہ گر تو ہی تھا ہمدم ہو
غضب ہے وائے قسمت اس مریضِ غم کی بیماری

کبھی انجام اس خونیں جگر کا تو نے سوچا ہے؟
اب آنسو کی جگہ آنکھوں سے جس کی ہے لہو جاری

سمجھ کر اپنا پابندِ محبت یوں ستم کرنا
یہ وہ جرمِ عمل ہے جس کو کہہ سکتے ہیں خونخواری

جو کھو بیٹھا ہو تیری یاد میں ہوش و خرد ظالم
نہ رکھ اُس کے لئے جائز تغافل اور خودداری

سلوک ایسا کر اے جانِ جہاں بیمارِ الفت سے
ہے بے چارہ مرتے مرتے محوِ شکرِ دلداری

یہ ظاہر ہے کہ جب تک سانس باقی ہے تب تک آس باقی ہے
بسا اوقات صحت پاتے ہیں برسوں کے آزاری

تعجب کیا کہ بچ ہی جائے وہ دم توڑنے والا
پرستاری میں تیری کاٹ دے پھر زندگی ساری

زمانے میں رہے افسانہ تیری دلنوازی کا
وفا کے ملک میں سکّہ ہو تیرے نام کا جاری

اگر مر بھی گیا، مر جائے، کہنے کو تو یہ ہوگا
کہ تو نے وہ کیا جو کچھ کہ تھا شایانِ دلداری

کوئی ناداں اگر بالفرض مزم بھی تجھے سمجھے
تو بڑھ سکتی ہے تیرے واسطے کیا اس میں دشواری

ہے اب بھی اک جہاں واقف ترے طرزِ تغافل سے
زمانے کی زباں پر آج بھی یہ لفظ ہیں جاری

[1] "ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور موت کو اپنی دوا سمجھے"

۱۰۔ تخمیس

(بر غزل حضرت غالب مغفور)

فروری ۱۹۱۵ء

ملی کیا شے ازل میں ایک قسمت اُلٹی وہ بھی
اُسی سے زندگی وابستہ لیکن بے سکوں وہ بھی

---

[1] نامعلوم

جو کچھ سرمایۂ عمرِ دوروزہ تھا کہوں وہ بھی   بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی

سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

محبت گو ہے بیگانہ تصنع سے تکلف سے   مگر جب غیر بھی رہنے لگے کچھ بے تکلف سے
ممیز اُن سے اپنے کو کیا ہم نے تکلف سے   رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چندے تکلف سے

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اجل کے آسرے پر ہم نے چاہا تھا کہ دل ٹھہرے   ٹھہر جاتا، جو ہوتے صرف جیتے جی کے یہ صدمے
نہ ہو جب مرگ کے بھی اُمیدِ آسائش تو پھر کہئے   خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے

مرے دامِ تمنا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی

فغاں سے پیشتر بھی دل تڑپتا تھا مگر کم کم   معاذ اللہ اب تو یہ تپش کا ہو گیا عالم
کہ گویا اک جہانِ بے قراری ہے دلِ پرغم   نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

تغافل دل ستانی کا ہے کوئی راز؟ فرماؤ   تکبر دلبری کا ہے کوئی انداز؟ فرماؤ
نہ یوں خونِ تمنائے دلِ جاں باز فرماؤ   نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ

مرے دریائے بے تابی میں ہے اِک موجِ خوں وہ بھی

ملے آرام زیرِ چرخ، کیا یہ حوصلا کیجے — امیدِ کامیابی ہو تو عرضِ مدعا کیجے
تہی ظرفوں سے کیوں نے کار کوئی التجا کیجے — مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

یہ سچ ہے رہتے ہیں عاشق کے دل میں پاس اِس قدر ارماں — کہ ثانی کے بقول اُن کا بیاں ہے خارج از امکاں
مگر سُن مجھ سے دو لفظوں میں شرحِ حسرتِ پنہاں — مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں

خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۱۔ مجبورِ محبت

مئی ۱۹۱۵ء

شاق ہے جینا؟ ہوا یہ کاہشِ غم کا اثر — تیرے قدموں کی قسم بارِ گراں ہے تن پہ سر
ہے تمنائے سکونِ قلبِ مضطر جس قدر — آرزوئے موت اُس سے بھی زیادہ ہے، مگر

جیسے کہتے ہیں مرے لئے راحتِ جاں تو نہیں

یوں ہی دل پر بس نہیں ہے موت پر قابو نہیں

جب یہ حالت ہے کہ تو مصروفِ جشنِ عید ہے — اور یہاں بر لب مریضِ اشتیاقِ دید ہے
کون ہو بالیں پہ، ہر شمعِ مردہ اُمید ہے — بے کسی ہے ظلمتِ نومیدیٔ جاوید ہے

تو دل آرائی پہ آمادہ ہو، یہ ممکن نہیں
دل شکیبائی پہ آمادہ ہو، یہ ممکن نہیں

اب سکوں ہو کس طرح ظاہر ہے معذوری مری
موت ہی باقی ہے جو حسرت کرے پوری مری
آہ یہ فصل، اور صحن باغ سے دوری مری
قابل صد رحم ہے افسوس مجبوری مری

گل چمن میں ہیں، چمن میرے دل ناشاد میں
میں قفس میں ہوں، قفس ہے قبضۂ صیاد میں

رحم کر اے موت، مجھ میں تاب غم اصلا نہیں
رحم کر اے موت مجھ سے دکھ سہا جاتا نہیں
موت کیا تجھ کو کسی کے درد کی پروا نہیں
موت کیا مشکل میں کام آنا ترا شیوا نہیں

تو ہی اک ملجا ہے میری التجا کے واسطے
موت ناامید مت کرنا خدا کے واسطے

آہ، قید زندگانی جس بلا کا نام ہے
وہ بقول غالبؔ اک "بند غم" و آلام ہے
جیتے جی راحت ملے گی یہ امید خام ہے
تو اگر آغوش میں لے لے تو بس آرام ہے

ہے خدا شاہد کہ مجھ میں رنج کا یارا نہیں
اب سوا اس کے کہ مر جاؤں کوئی چارا نہیں

تیری ڈیوڑھی کو سمجھ کر درگہِ عشقِ دوام
منتظر ہوں صبح سے اے موت اب ہوتی ہے شام

دل میں تیری ہی یاد ہے، وردِ زباں ہے تیرا نام
آرزو میری نہ رہنے پائے بے نیلِ مرام

ہے فقط تیرے کرم پر منحصر راحت مری
تیرے ہی دامن سے وابستہ ہے اب حسرت مری

آہ، پیاری موت، اب تو دن بہت کم رہ گیا
آفتاب اپنی شعاعیں لے کے مغرب کو چلا

ہے سہانا وقت، گلزارِ جہاں ہے پر فضا
آج کی یہ شام ہو بس میری شامِ مدعا

بعد مغرب آج مجھ کو بے کس و تنہا نہ چھوڑ
ہاں شبِ غم کے مظالم کے لئے جیتا نہ چھوڑ

جلد آ للہ، دن کی روشنی جانے لگی
رات اپنے کاکلِ مشکیں کو بکھرانے لگی

ہاں، مرے کہنے سے تو اے موت کیوں آنے لگی
ہائے تو بھی نازِ معشوقانہ فرمانے لگی

خونِ حسرت کر دیا، کیا کچھ کسی سے کم ہے تو
کیوں نہ ہو آخر تو اُن کی تیغ کی ہمدم ہے تو

جوشِ وحشت، اب فقط تیرا سہارا ہے مجھے
مشغلہ صحرا نوردی کا بھی پیارا ہے مجھے

کب اسیری موسمِ گل میں گوارا ہے مجھے
آ ادھر، یہ روحِ مجنوں کا اشارہ ہے مجھے

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائیے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائیے ہے

ہاتھ اٹھ جاتا ہے رہ رہ کر گریباں کی طرف — وحشتِ دل کہہ رہی ہے چل بیاباں کی طرف
پاؤں لیکن بڑھ رہے ہیں کوئے جاناں کی طرف — بے قراری کھینچتی ہے راحتِ جاں کی طرف

مخمصے میں دل پڑا ہے کش مکش میں جان ہے
آہ، اب مانی ہے، اور یہ جان گزاساماں ہے

۱۲- کلی

جولائی سنہ ۱۹۱۵ء

زبانِ حال سے یوں کہہ رہی تھی ایک کلی — میں نقشِ زیب وہ صفحۂ بہاری ہوں
میں جانِ گلبن و روح و روانِ گلشن ہوں — تمام اہلِ نظر اہلِ دل کی پیاری ہوں
میں مہوّل جہاں میں افسانہ سازِ رنگِ چمن — میں صحنِ باغ میں رازِ شگوفہ کاری ہوں
اسی کے ساتھ سُنی ایک صدائے حزیں — تو مستِ حسن ہے، میں صرفِ بیقراری ہوں

لہ نامعلوم۔

تجھے تو مجھ سے تغافل ہے، اور استغنا — میں مستمند مداوائے دل فگاری ہوں

اگر تو ناز سے آمادۂ جاں ستانی ہے — تو میں بہ شوق مہیائے جاں سپاری ہوں

تو خیر ہے تبسم عروجِ بخت یہ ہے — میں سرنگونیِ قسمت پہ صرفِ زاری ہوں

میں جانتا ہوں کہ بلبل ہوں یعنی وہ مخلوق — کہ اپنی ذات سے خود اپنی وجہ خواری ہوں

اگرچہ دل سے ہوں مجبور، پھر بھی ہے یہ گناہ — ہے تیری دُھن، ہمہ تن شوقِ جاں نثاری ہوں

رہا ہے مدتوں میں وقتِ عرضِ حالتِ دل — مگر تو چپ میں سراپا امیدواری ہوں

غرورِ حُسن اُدھر مانعِ کلام، تجھے — اِدھر میں وقفِ صد اندوہ بے قراری ہوں

جواب صاف نہیں خیر اے کلی نہ سہی
اشاروں ہی میں یہ کہہ دے کہ میں تمہاری ہوں

۱۳۔ غزل

جولائی ۱۹۰۵ء

خود نما نے خود کو جب وقفِ تماشا کر دیا — میں نے دامانِ نظر سے رُخ کا پردا کر دیا

مَیں نہیں سمجھا، خدا کے واسطے سمجھائیے — آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کیا کہہ دیا کیا کر دیا

میری بے تابی، تمہارا غیر معمولی حجاب — مجھ کو بھی، تم کو بھی، ان دونوں نے رسوا کر دیا

حشر ہے، اور داورِ محشر ہے علام الغیوب
تم چھپالو قتل، اب میں نے تو دعویٰ کر دیا

آزمانی آج میں نے دید کا ارمان بھی
خیر سے نذرِ نگاہِ یاس افزا کر دیا

۱۴۔ سکونِ یاس

ستمبر ۱۹۱۵ء

بیکار ہے اب شکوۂ تقدیرِ زبوں کام
بے فائدہ ہے اب گلۂ گردشِ ایام

راتیں بھی بہت دیکھ چکے عمر میں دن بھی
تکلیف بہت پائی، اٹھایا بہت آرام

نہ راحتِ ماضی سے ہے اب دل متلذذ
نہ باعثِ ایذا ہیں وہ گزرے ہوئے آلام

جو کچھ بھی ہوا تجربہ حاصل، وہ فقط یہ
تسکیں نہ کبھی ہوگی نصیبِ دلِ ناکام

کیا شے ہے سکوں، یہ نہیں معلوم مگر ہاں
عنقا کی طرح یہ بھی زمانے میں ہے اک نام

جب تک ہے ذرا بھی جھلک امید کی باقی
اس وقت تک امیدِ سکوں ہے طمعِ خام

لو چھوڑ دیا میں نے اس امید کا دامن
اب یاس میں نکلے گی مری حسرتِ آرام

اب کوئی تغیر ہو، نہیں میں متاثر
باقی ہی نہیں مجھ میں حسِ شادی و آلام

جب جان چکا میں کہ نہ ٹھہرے گا کبھی دل
یکساں ہے مجھے دن ہو کہ شب صبح ہو یا شام

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

۱۵۔ غزل

جنوری ۱۹۱۶ء

باتنا ہی کیا ہے، اک بڑا نہ رہے — نہ رہے جانِ مبتلا نہ رہے
آگ سینے میں ہو گوارا ہے — دلِ محرومِ مدعا نہ رہے
نہیں، آلودہ ہو نہ دامنِ گل — ہاں، مری خاک یا صبا نہ رہے
قفسِ زر نہ چاہیے یا رب — میرے تنکوں کا آشیانہ رہے
دیکھیں ثانی آشیاں برباد — اب چمن میں رہے بھی یا نہ رہے

۱۶۔ غزل

مارچ ۱۹۱۶ء

درست اے[۱] گریۂ ہجر آج دل ٹپکا ہے پہلو میں — مگر کچھ پارہ ہائے دل بھی تھے مخلوط آنسو میں

۱؎ نامعلوم

شمولِ خونِ دل سے ہو گیا گُل رنگ یا شاید
تمہارے رنگِ عارض کا اثر ہے میرے آنسو میں

کسی کی آنکھ سے افسانۂ غم پر جو نکلا ہو
جتائے صد ہزار آلام ہے اُس ایک آنسو میں

اثر دل دوز جوانی کی نگاہِ اولیں میں تھا
الٰہی منتقل ہو جائے اب وہ میرے آنسو میں

میں سوزِ ہجر سے آتش بجاں ہوں مگر بھی راضی ہوں
کہ اک نسبت ہے میرے حال میں اور آپ کی خو میں

وہ ہے آج آشیاں برباد جو کل ناز کرتا تھا
کہ ہے میرا نشیمن شاخِ گُل پر گُل کے پہلو میں

نہیں فرصت ہوگی کشمکش ہائے تمنا سے
مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے قابو میں

میں ڈرتا ہوں خدا کے واسطے تیور نہ بدلو تم
نظر آتی ہے موجِ خونِ ارماں چینِ ابرو میں

پتہ معلوم لیکن دسترس دشوار اے آنی
ہے سامانِ کشودِ عقدۂ دل عقدِ گیسو میں

۱۷- غزل

اگست سنہ ۱۹۱۶ء

اجازت دیجئے رونے کی اب تو دل کی حالت پر
بہت اچھا نہیں آمادہ ہوا ترکِ محبت پر

زبانیں تیز ہیں سب کی نصیحت اور ملامت پر
کبھی رونے کو بھی آیا کوئی دل کی مصیبت پر

سمجھ لیتے تو صبر آتا سزائے جرمِ الفت پر
نہیں سمجھے اگر اس لئے روتے ہیں قسمت پر

کسی کی رائے میں یوں تو سراپا عیب تھا لیکن
تصنع کا بڑا الزام تھا مجبورِ الفت پر

امید افزا کوئی صورت، نہ تسکیں کا کوئی پہلو
نتیجہ کیا، وہ قائم ہی سہی عہدِ محبت پر

نہیں ہے بازپرسِ آخرت سے کوئی مستثنیٰ
غلط کیا ہے اگر جیتا ہوں امیدِ قیامت پر

دیا پہلے ہی اربابِ ہوس نے کچھ فریب ایسا
انہیں اب اعتبار آتا نہیں اہلِ محبت پر

مرے احباب میرا حال کہہ دیتے ہیں کیوں جا کر
میں ان سے بچ کے ہوتا ہوں خجل اُن کی ندامت پر

وہ نقشِ سادگی ہے دل پہ اے مانیؔ کہ ہے اب تک
تلافیِ ستم کا اعتبار اُس بے مروت پر

۱۸۔ غزل

نومبر سنہ ۱۹۱۶ء

پڑا وہ پاؤں جس جا، سر بھی میرا اُس زمیں پر تھا
وہی نقشِ قدم گویا مری لوحِ جبیں پر تھا

یہ میں نے کب کہا تھا، آپ کے ابرو نہیں قاتل
مجھے کچھ شک اگر تھا بھی تو دستِ نازنیں پر تھا

عرق شرمِ جفا سے اُن کی پیشانی پہ کب آیا
پسینہ موت کا، افسوس جب میری جبیں پر تھا

گلہ بے جا بھی کرتا ہوں کہ اُس جلوے کا شائق ہوں
ندامت سے جو اک دن آپ کے روئے حسیں پر تھا

کبھی پہلے نہ تھا مبذول مجھ پر التفات اُن کا
مگر یہ منحصر میری نگاہِ واپسیں پر تھا

زبانِ عجز ہے، اب ہم بےتابی سے کیا ڈرنا — یہی الزام عہدِ وصل میں تھا، اور یہی یہ تھا

نہ ہو یہ منتہی تحریکِ ترکِ بت پرستی پر

دلِ مانی میں یہ خطرہ نزاعِ کفر و دیں پر تھا

۱۹- حُسن و عشق

(مناظرہ)

دسمبر ۱۹۱۶ء

عالمِ اسباب میں جب سے نمودِ عشق ہے — دائرِ امکاں جب سے مبنی بر وجودِ عشق ہے

شعلۂ اُلفت کا جب سے روئے گل گوں ہے نقاب — زلف جب سے دامِ پیچ و تابِ دودِ عشق ہے

جب سے اہلِ حسن کی گردن پہ ہے احسانِ عشق — حسن کے پیکر میں جب سے جلوہ گر ہے جانِ عشق

دیکھتے آئے ہیں اب تک اہلِ بینش متصل — بارگاہِ حسن میں جو کچھ رہی ہے شانِ عشق

یعنی جب کی حسن نے برپا کہیں بزمِ شباب — اور ہوا عشقِ الم خو اتفاقاً باریاب

انکسار و عجز پر دیکھا ہے پھر کبر و غرور — التجاؤں پر سُنے ہیں بے نیازانہ جواب

رات کا قصہ ہے، دیکھا ہیں نے اک منظر عجیب — بزم میں اک سمت صدر آرا تھا اک عشرت نصیب

سامنے ساقی و مطرب شمع و گُل جام و سبو — اور تھا پائینِ بزم اک بے نوا، بے کس غریب

ہوتا ہے اوّل کو آخر سے علاقہ جس طرح — صدر کو بھی اک تعلق خاص ہے پائین سے

صدرِ بزمِ ناز گویا تھا، ایک بامِ حسن تھا — جلوہ گر جس بام پر قائم مقامِ حسن تھا
بزم کی پائین میں تھا مامن و ماوائے عشق — سر بزانو جس جگہ شیدائے نامِ حسن تھا

تھی وہ محفل جس کا ہر گوشہ تجلی بیز تھا — ذرّہ ذرّہ فرحت افزا تھا، نشاط انگیز تھا
گو اِدھر اک دلِ گرفتہ کے لبوں پر آہ تھی — اُس طرف لیکن مغنّی یوں ترنّم ریز تھا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا[۵] — شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

عشق جو بیٹھا ہوا تھا ایک گوشہ میں نڈھال — چونک اُٹھا سنتے ہی یہ پیار القابل حسبِ حال
آسماں کو دیکھ کر نالہ فلک فرسا کیا — حسن پر ڈالی نظر، پھر ہو گیا محوِ خیال

عشق کا نالہ بہت دل دوز پُر تاثیر تھا — یا یہ کہئے شعرِ غالب تھا، کلامِ میر تھا
حسن کا قلب اس طرف بے ساختہ کھنچنے لگا — نالہ کیا، دل کی کشش کے واسطے زنجیر تھا

حسن نے آخر بلایا اُس کو اپنے روبرو — اور یوں پوچھا، بتا اے دل جلے ہے کون تو

---

۵ حضرت غالب مغفور۔

عشق نے دل تھام کر کی عرض باچشمِ پُرآب
"تیرا بندہ ہوں، ترا شیدا ہوں میں اے شعلہ خو"

بس یہ سننا تھا کہ چہرے پر مسرت چھا گئی
دل کشی کچھ بڑھ گئی، کچھ اور رونق آ گئی

جھک گئیں آنکھیں مگر جب بعد تھوڑے جھک کے اٹھیں
شان وہ پیدا ہوئی، ہر دل کو جو تڑپا گئی

میں نہیں واقف، مگر کہتے ہیں دانایانِ راز
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتے تھے بہم راز و نیاز

یا بظاہر چھا رہا تھا بے خودی کا جو سماں
دب گئے تھے شاید اُس سے نغمہ ہائے سوز و ساز

خامشی یوں ہی غرض کچھ دیر مستولی رہی
حُسن کے نازک لبوں کو آخرش جنبش ہوئی

مُسکرا کر یوں کیا اربابِ محفل سے خطاب
"اللہ اللہ دیکھئے تو شوخ چشمی آپ کی"

عشق سے پھر یوں کہا اللہ یہ جرأت تجھے
میرا شیدا کیوں ہے آخر مجھ سے کیا نسبت تجھے

بے اجازت بے طلب کیوں آ گیا تو بزم میں
کھینچ لائی ہے یہاں شاید تری شامت تجھے

کیا نہ تھا معلوم تجھ کو یہ کہ ہے دربارِ حسن
جلوہ گر ہیں بزم کے پردے میں یاں اسرارِ حسن

حاجبِ درگاہ رہتے ہیں سلاطیں سر بکف
واجب التعظیم ہے اے بے ادب سرکارِ حسن

حُسن کی وہ شان ہے جس کا نمایندہ ہوں میں
حُسن کا وہ تخت جس کی تمکنت فرما ہوں میں

تو بھی واقف ہوگا، عالم پر تو روشن ہے یہ راز
یعنی ہر اہلِ نظر کی آنکھ کا تارا ہوں میں

مرکزِ صد نغمۂ امید میرا ساز ہے
دل نوازِ اہلِ باطن میرا ہر انداز ہے

ہر ادا میری ہے برقِ خرمنِ صبر و قرار
فاتحِ ملکِ تحمل میری تیغِ ناز ہے

حکم تھا میرا جو کیں فرہاد نے جاں بازیاں
میرے ایما سے تھیں مجنوں کی جنوں پردازیاں

پوچھ لے جا کر زلیخا سے زنانِ مصر سے
کیسی حیرت خیز تھیں میری کرشمہ سازیاں

اکبرِ اعظم کا وہ فرزند شہزادہ سلیم
میری شمشیرِ ادا نے دل کیا جس کا دو نیم

گو اُسے ہندوستاں کا تختِ شاہی مل گیا
چین لیکن تب ملا جب میں ہوا اُس کا ندیم

مُجھ کو کہتا ہے جہاں عالم پناہِ آرزو
میری بزمِ ناز ہے آماج گاہِ آرزو

مقصدِ اہلِ تمنا جلوہ آرائی مری
میرے عارض کی ضیا نورِ نگاہِ آرزو"

عشق بولا "گو مجھے آتی نہیں لاف و گزاف
لیکن اب میری زباں کھُلتی ہے گستاخی معاف

اپنے قدموں میں مجھے رہنے دیا ہوتا خموش
اور چھیڑا ہی تو سُن اے حُسن مجھ سے صاف صاف

تو یہ کہتا ہے مجھے تجھ سے کوئی نسبت نہیں
یہ وہ دعوٰی ہے، ذرا بھی جس کی اصلیت نہیں

یاد رکھ، وابستہ میرے دم سے ہے تیری نمود
ورنہ تیری خود نمائی موجبِ شہرت نہیں

بے طلب آنا مرا تجھ پر گراں گزرا اگر،
میں ادب کے ساتھ خواہانِ معافی ہوں مگر

میں نہ ہوں تو پھر کیسے تسلیم ہو تیرا وجود
تیرا جلوہ چاہتا ہے یہ کہ ہو میری نظر

واجب التعظیم ہے لاریب تیری بارگاہ
ہے مجھے بھی پاسِ حفظِ مرتبت خالق گواہ

آہ! لیکن تو نے مجھ کو بے ادب ٹھہرا دیا
اک ذرا انصاف کر کفرانِ نعمت ہے گناہ

تو نمایندہ ہی شانِ حُسن کا بے اشتباہ
تجھ سے زیب و زینِ تختِ حسن اے نخوت پناہ

سب مجھے تسلیم، لیکن یہ خبر بھی ہے تجھے
حُسن کیا ہے، ایک جلوہ، میرا ممنونِ نگاہ

ہاں یہ سچ ہے دیکھنے والوں میں اکثر بیشتر
تجھ کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں، مگر

اس کا باعث ہے فقط اے حسن میری دشمنی
میری تختِ سنیاہی ایسے لوگوں کی نظر

نغمہٴ امید املو جس سے تیرا ساز ہے
کچھ نہیں ہی میری پیدا کی ہوئی آواز ہے

تجھ سے سُن، ہی ایک اُڑنے تابع فرماں مرا
دل، وہ دل جس پر نوازش کر کے تجھ کو ناز ہے

مانتا ہوں میں کہ تو ہی دشمنِ صبر و قرار
اور تسلیم و رضا پر میری فطرت کا مدار

سہ آنچہ در کردار فخر تست آں ننگِ من است
ہو مبارک تجھ کو یہ دعوے، یہ ناز و افتخار

وہ زنانِ مصر ہوں یا بے نوا فرہاد ہو
ہاں زلیخا ہو کہ قیس خانماں برباد ہو

سب مرے پیرو تھے غافل، ورنہ تیرا کیا قصور
اس بشر پہ جو مری تقلید سے آزاد ہو

فرض کر لے تو کہ ہاں، تیرا ہی سبق تھا سلیم
میں نہ رکھتا گر اُسے راہِ طلب میں مستقیم

کیسے بن جاتی تری مہرالنسا نورِ جہاں
کیسے ہو جاتی وہ تاجِ ہند کا دُرِّ یتیم

مان لیں تجھ کو اگر اے حسن شاہِ آرزو
آستانے کو ترے سمجھیں پناہِ آرزو

پھر بھی مجھ میں اور تجھ میں فرق ہے بہت ہی
میں ہوں خلاقِ تمنّا، میں الٰہ آرزو

سُن لیا اے حسن تو نے اپنی باتوں کا جواب
چُپ رہوں اب میں اگر تو ہو گیا ہو لاجواب

ورنہ کہنے کو تو میرے دل میں باقی ہیں ابھی
ایسے کچھ نکتے کہ جن کا ہو نہیں سکتا جواب

اُس نے فرمایا کہ "ہاں اے عشق بہتر ہے سنا
رہ نہ جائے تا کہ تیرے دل میں کوئی حوصلا"

عشق نے یہ سن کے پہلے حسن کو دیکھا بغور
پھر نہایت وجد کے عالم میں یوں کہنے لگا

"سُن توجہ سے کہ میں کیا ہوں، ترا رتبہ ہی کیا
تو عرض ہی میں ہوں جوہر، مس ہے تو، میں کیمیا

مستقل میں، عارضی تو، میں حقیقت، تو مجاز
جسم تو ہی، روح میں، تجھ کو فنا، مجھ کو بقا

اے بسا گلشن کہ از گلہائے تر آباد نیست
عندلیبے کو کہ صرفِ نالہ و فریاد نیست

شورِ بلبل[1] گم نہ گردد، گر رود گل از چمن
حُسن بے بنیاد باشد، عشق بے بنیاد نیست

حُسنِ خود بیں نے سنا اِن عشق کی باتوں کو جب
چاند سا مُنہ تمتما اُٹھا، بڑھا غیظ و غضب

---

[1] نامعلوم

زلفیں بل کھانے لگیں، غصے میں یوں کہنے لگا
بس خموش اے عشق بس، ملحوظ رکھ حدِ ادب

کیا جہاں میں مظہرِ آیاتِ قدرت میں نہیں
حور کے پیکر میں زینت بخش جنت میں نہیں

صورتِ اختر میں کیا تو نے نہیں دیکھا مجھے
جامۂ پیغمبری میں حق کی رحمت میں نہیں

سوچ اے ناداں تیرے دل کی راحت کون ہے
ہو تری تسکین کا باعث، وہ صورت کون ہے

میرا بندہ، تو نے اپنے کو کہا تھا یا نہیں
تو ہی اب بھی بتا شایانِ عزت کون ہے"

بسکہ لا سکتا نہ تھا تابِ نگاہِ پر فسوں
عشق تھا لرزاں و خائف، اشک ریزاں سرنگوں

آخر کار اُس نے پائے حسن پر سر رکھ دیا
چھٹ گیا ہاتھوں سے یعنی دامنِ صبر و سکوں

حسن کی جانب سے ہونے تھے سوالوں پر سوال
عشق بالکل دم بخود تھا غرقِ بحرِ انفعال

امتثالِ امر کو پاسِ ادب پر فوق ہے
یہ خیال آیا تو فوراً یوں ہوا صرفِ مقال

"ہاں ترا بندہ ہوں میں، ہاں تیرا مرعوبِ جمال
رہ گیا اے حسن ترجیح و تفوق کا سوال

اپنی عزت کی قسم ہے تجھ کو، یہ مجھ سے نہ پوچھ
بلکہ آپ ہی کو حکم گردان بہرِ انفصال

علم کامل گو نہیں اُس کو ہماری ذات کا
پھر غنیمت ہے کہ ہے فی الجملہ ہم سے آشنا

اُس کی معلومات کے شاہد بھی دو موجود ہیں
یعنی تیرا کارنامہ[۱] اور میرا فلسفا[۲]

---

۱ و ۲ کارنامۂ حسن اور فلسفۂ عشق مصنف کی دو نظمیں ہیں ۱۲

جلوہ گاہِ ناز میں مانی ہوا آخر طلب
بیٹھے اہلِ بزم سب تہ کر کے زانوئے ادب

جب دلائل حسن کے بھی عشق کے بھی سن لیے
فیصلہ اپنا سنایا اس طرح مانی نے تب

"اپنے اپنے رنگ میں ہو لاجواب اے حسن و عشق
ضوِ عالم ہے دونوں کی جناب اے حسن و عشق

ہم خدا لگتی کہیں گے، کوئی خوش ہو یا خفا
دونوں ہو تم ماہتاب و آفتاب اے حسن و عشق

عشق کی ہستی حقیقت میں بقائے حسن ہے،
عشق کا طرزِ عمل عزت فزائے حسن ہے

پرتوِ خورشید سے روشن ہے جیسے ماہتاب
عشق یونہی باعثِ نورِ ضیائے حسن ہے"

حسن جس کو اہلِ ظاہر کہتے ہیں نازآفریں
ناموافق فیصلہ سن کر ہوا چیں بر جبیں

اُٹھ گیا دامن کشاں ظالم عدالت گاہ سے
عشق چیخ اُٹھا کہ قربان ادائے دل نشیں

روح نو وقتِ نظر آنکھوں میں آئی بے قرار
آہ، اب کیا ہے کہ ہو پیاری ادا دل کی نثار"

داستانِ عشق طولانی ہے قصہ مختصر،
دیر تک ملے کس لیے نہی بکتا رہا دیوانہ وار

اول اول شرح بالتفصیل داد افسانہ را
آخر آخر ساز کرد ایں نغمۂ مستانہ را

"جاں ز نظارہ خراب ناز او ز اندازہ بیش
ما بہ بوئے مست ساقی کردہ ہم پیمانہ را"[1]

---

[1] نامعلوم

۲۰۔ غزل

جنوری ۱۹۱۷ء

غش تو سنا تھا جلوۂ صاعقہ بار دیکھ کر
مجھ کو مگر یہ کیا ہوا روئے نگار دیکھ کر

تنگ ہے وسعتِ فضا تجھ کو تو بیٹھ جا کہیں
دامنِ یار کو مگر مشتِ غبار دیکھ کر

کیا کہوں اپنی سرگذشت میں نے چمن میں دل دیا
اور قفس میں جان دی، روئے بہار دیکھ کر

میں بھی وہی، جہاں وہی، گردشِ آسماں وہی،
پھر یہ نیا سا جوش کیوں اب کی بہار دیکھ کر

ختم تو تھی ہی زندگی، باغ نہیں قفس سہی
شکر یہی ہوا اسیر لطفِ بہار دیکھ کر

ایک مرے نہ دن پھرے، ورنہ جہاں کے واسطے
دورِ فلک بدل گیا دورِ بہار دیکھ کر

عمر تو صرف ہو چکی قیدِ قفس میں باغباں

چھوڑئیے اب کہ مر رہوں ایک بہار دیکھ کر

بے خبر اپنے جلوۂ نور فزائے خلق سے

آئے تھے وہ نہ بجھی ہوئی شمع مزار دیکھ کر

مانیِ دلِ حزیں کہا، بیٹھ گئے جھکا کے سر

ہائے وہ اک مٹی ہوئی لوحِ مزار دیکھ کر

۲۱- غزل

جنوری ۱۹۱۷ء

اک نظر ہے عمر بھر کی کاہشِ دل کا عوض
اک تبسم، خونِ صد ارمانِ بسمل کا عوض

غم دیا ایسا، کہ اب دنیا سے مستغنی ہوں میں
اور کیا دیتے وہ اک ٹوٹے ہوئے دل کا عوض

مل گئیں وہ شوخ نظریں، آخر اب کیا دیر ہے
لے نگاہِ یاس حسرت ہائے بسمل کا عوض

امن پہ غافل نہ ہونا، اضطرابِ موج میں
دیکھ لو پنہاں سکونِ سطحِ ساحل کا عوض

ہے غبارِ راہ کے پردے میں مانی خاکِ قیس

عشق پہ باقی نہیں احسانِ محمل کا عوض

۲۲۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۱۷ء

جھگڑا ہی چکا میں بھی چلا، دردِ جگر بھی
اب کیا ہی اگر ہو شبِ فرقت کی سحر بھی

جال بر نہ ہوا میں، یہ جدا بات ہی، ورنہ
ظاہر ہی کہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر بھی

دیکھے گی کسے اُن کے سوا یہ نگہہ شوق
مالک ہی جو دل کا وہ ہے مختارِ نظر بھی

کیا عرض کروں منتظرِ جلوہ کی حالت
دیکھی ہے کبھی آپ نے تصویرِ نظر بھی

یارا کسے یک جنبشِ ابرو کا ہے مانی
کافی ہے تباہی کے لئے نیم نظر بھی

۲۳۔ دیارِ دوست

مئی سنہ ۱۹۱۷ء

نہ تڑپ مرے دلِ مضطرب، کہ دیارِ دوست میں آگیا
وہ دیار جس کا ہر ایک ذرّہ سرور زا و فرح فزا
وہ دیار جس کی زمین ہے، غیرتِ آسمانِ چہارمیں
وہ دیار، ہاں وہ دیار جس پہ قدم ہے تیرے مسیح کا

جدھر آنکھ اُٹھا کے نگاہ کیجئے، اک سماں ہی بہشت کا

کہیں وجد میں ہیں نہال جھومتی چل رہی ہے کہیں صبا

کہیں شاخِ سرو پہ قمریاں ہیں وفورِ شوق میں نعرہ زن

کہیں نغمہ سنجِ وصالِ گل کے قریں ہے بلبلِ خوش نوا

یہ چٹک رہی ہے کوئی کلی، یہ ہوا ہے کوئی شگوفہ وا

کہ یہ کھل گئے لبِ حور، اور یہ نکلی زمزمے کی صدا

نہیں یہ نہیں، میں سمجھ گیا کہ نوائے خندۂ گل ہے یہ

کبھی جس کا ذکر سنا تھا ہم نے، اب اس ہنسی کو بھی سن لیا

یہ کچھ انبساط کا جوش ہے، مگر اے مرے دلِ مبتلا

ترا اضطراب تو اور بھی نظر آ رہا ہے بڑھا ہوا

ٹھہر اب خدا کے لئے ٹھہر کہ میں صرف سیرِ بہار ہوں

تری بے قراریوں نے تو آہ محال کر دیا دیکھنا

تو شگفتہ ہو تو چلا دوں ابھی تجھے لے کے کوئے نگار میں

ترے ساتھ میں بھی پڑا رہوں، اُسی جلوہ گاہِ بہار میں

یہ بجا ہے تیری نظر میں ہی وہ فسانہ طور و کلیم کا
وہ ہجومِ شوق، صدائیں وہ ارنی کی اور وہ التجا
وہ بہت خفیف سی اک جھلک سرِ طور برقِ جمال کی
وہ غشی کلیم کی اور جبل کے وہ سرمہ ہونا پہاڑ کا
مگر ایسی باتوں سے راہِ عشق و طلب میں ہی تجھے خوف کیا
کہ مصیبتیں ہیں مآلِ آرزو و نتیجۂ مدّعا
نہ رہیں جو ہوش ترے بجا سمجھ اس کو لرزشِ یک نظر
اگر اُن کے جلوے پہ مر گیا تو جزائے دید ہوئی ادا
تری ہمتوں پہ نثار ہیں ماترے حوصلوں پہ ہوں میں فدا
مری روح لطف اُٹھاتی ہے تری اس ادائے جواب کا
کوئی غش ہے جلوۂ دوست پر ہیں اُمیدِ جلوۂ دوست پر
کوئی جان دیتا ہے وصل میں ہیں اُمیدِ وصل پہ مٹ گیا
ہے نویدِ زندگیٔ ابد، دلِ باخبر تری یہ صدا
کہ مراد جذبۂ شوق سے ہے اگر تو بس کششِ قضا

نظر آرہی ہے اسی خیال میں مجھ کو جنت آرزو
اسی ایک بات پہ دیکھتا ہوں میں انحصار سکون کا
تری قبر ہو مرے سینے میں، مری قبر کوئے نگار میں
رہیں آرمیدہ ہمیشہ پھر، اسی جلوہ گاہِ بہار میں

۲۴- مہجور پپیہا

جولائی سنہ ۱۹۱۷ء

کس قدر دلچسپ، کیسا دل کشا منظر ہے آہ
جھومتا آتا ہے مستوں کی طرح ابرِ سیاہ
سوچتے ہیں بادہ کش بیٹھے ہوئے عذرِ گناہ
دیکھ لینا اب نہ ہوگا ان سے توبہ کا نباہ
لالۂ و گُل کی لہک ہے دامن کہسار میں
شعلۂ اُلفت بھڑک اُٹھا ہے قلبِ زار میں
برق چمکی کالے کالے ابر دریا بار میں
یا ابیدِ وصل ہے فرقت کے عہدِ زار میں

یہ پرندوں کی صدا سے گونجتا ہے آسماں
طعنہ زن یا باغِ جنت پر ہے گلزارِ جہاں
ایک جانب کوئلیں افسانہ سنج بوستاں
دل کو برماتی ہے اک جانب پپیہے کی فغاں
سچ ہے اہلِ مُدعا ہونا مصیبت ہے بڑی
آفتیں رہتی ہیں آئے دن دیرِ دل پر کھڑی
نالہ یوں لیکن کہاں کرتا ہے کوئی ہر گھڑی
اے پپیہے تجھ پر آخر ایسی کیا بپتا پڑی
اُس قدر دل دوز ہو فریاد جس کی الاماں
کیا غضب ہو گی خدا جانے پھر اُس کی داستاں
سُنتے ہیں اک عمر سے ہم تو یہی شورِ فغاں
پی کہاں ہو، پی کہاں ہے، پی کہاں ہے، پی کہاں
کچھ سنیں ہم بھی تو کس کی دُھن میں آوارہ ہے تو
ڈھونڈھتا ہے کس کو یوں صحرا بہ صحرا، سو بہ سو

ہر نفس تیرا ہے پائے سعیِ راہِ جستجو،
ہر صدا بانگِ درائے کاروانِ آرزو

تو سراپا شوق بن کر پھرتا ہے دیوانہ وار
یا کیا ہے شوق نے خود تیرا قالب اختیار

تیری ہر آواز میں ارمان مضمر ہیں ہزار،
آہ، اِک سازِ تمنا ہے کہ ہے تیری پکار

خیمہ زن ابرِ بہاری زیرِ چرخِ پیر ہے
یا دھواں ہے تیری آہوں کا کہ عالم گیر ہے

تو ہوا میں ہے کہ میری آہ خوش تدبیر ہے
عازمِ عرشِ معلےٰ، در پئے تاثیر ہے

تو دلِ عاشق ہے، تیری جان دردِ آرزو
اور سعیِ گرم تیری، نبضِ سردِ آرزو

تو چلا ہے اُڑ کے اے صحرا نوردِ آرزو
یا اُڑا ہے روح بن کر رنگِ زردِ آرزو

اے کہ تیرے واسطے بسطِ فضا عمّانِ ہجر
تجھ کو ہر موج ہوا اک موجۂ طوفانِ ہجر،
تو اکیلا، ناخدا کوئی نہ کشتی بانِ ہجر
اُف یہ جانِ زار، یہ دریائے بے پایانِ ہجر

اے وجودِ مضطرب، اے مظہرِ شانِ فراق
صبر کر، مٹ جائے گا یہ دورِ دورانِ فراق
آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمنِ جانِ فراق
اک نہ اک دن چاک رکھا ہے گریبانِ فراق

۲۵- غزل

نومبر ۱۹۱۷ء

گلہ کسے ہی، اگر آپ دل نواز نہیں
کوئی سلوک ہو بارِ سرِ نیاز نہیں

جفاؤ ناز میں یہ فرق ہی کہ آہِ رسا
حریفِ خوئے جفا ہی، حریفِ ناز نہیں

شبِ فراق میں ہو ہی ہے گئے تم نے دل
اب اِس قدر تو فسانہ ترا دراز نہیں

گناہگار ہوں، اُمیدوارِ رحمت ہوں
مجھے عمل پہ بھروسا نہیں ہے ناز نہیں

بُرے نصیب سے کیا زور، ورنہ اے مانی . وہ حق گزار نہیں ہیں کہ دل نواز نہیں

۲۶ غزل

جنوری سنہ ۱۹۱۸ء

عبادت میں جو ہیں نیکی کے پہلو اُن کو مت دیکھو
نہ آؤ دیکھنے مجھ کو، تم اپنی مصلحت دیکھو

تمنّا ہے کہ جیسا میں غمِ فرقت میں رہتا ہوں
کسی دن تم بھی ویسا ہی مجھے بے عافیت دیکھو

بہت نیرنگیاں اے دوستو دیکھیں ادھر آؤ
ہماری بزمِ ماتم، اُن کا جشنِ تہنیت دیکھو

اُدھر آنکھیں تمہاری تر ادھر میرا لہو، پانی
مرے دل کی طرف، کہتا تھا مَیں تم سے کہ مت دیکھو

گلہ کیسا، نظر بار آئے دل پر ہو تو اے مانی
تم اُن کی بے وفائی میں بھی پنہاں مصلحت دیکھو

۲۷۔ ناشکیبائی معذور

اپریل ۱۹۱۸ء

صبر کی اُن سے توقع ہے خدارا انصاف
سامنے جس کے وہ آئے ہوں برافگندہ نقاب

دیکھو تقدیر کس انجام کو پہنچاتی ہے
میں ہوں دیوانۂ شوق اور وہ ہیں مستِ شباب

پھر غضب یہ کہ مرے بخت کی ہمدم شومی
اُن کی آنکھوں میں مروت کی جگہ قہر و عتاب

اُن کو پروا بھی نہیں اور یہ نالہ کناں
آہ، "ماندہ است زدل قطرۂ خونے دریاب"[1]

زندگی کٹنے کو کٹتی ہے مگر حال یہ ہے
چین میرے لئے عنقا ہے مسرت نایاب

جان ہے آتشِ اندوہ سے پھکنے کے لئے
درد ہجراں سے تڑپنے کو دلِ خانہ خراب

حسرت "خس شدہ" دل سے جو اُٹھا ہے بخار
میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے وہ بن کر خوناب

انتہا بھی کوئی مجبوری و ناکامی کی
نہ پرائے، نہ دل اپنا، نہ مجھے صبر و تاب

تا کجا سعیِ تحمل بہ امیدِ موہوم
دوڑے کب تک کوئی پیاسا لبِ تماشائے سراب

ضبط در کارِ محبت، مرے ارمان بے چین
"عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب"[2]

دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک

---

[1] عرفی۔ دریاب کہ ماندہ است زدل قطرۂ خونے ۱۲ [2] حضرت غالب مغفور ۱۲

۲۸۔ غزل

ستمبر ۱۹۱۸ء

جاؤ بالیں سے اٹھو تو موت کو آنے تو دو ۔۔۔ چین سے جینے نہیں دیتے ہو مر جانے تو دو

صبح تو آخر کو ماتم ہے تمہارا در میں ۔۔۔ حسرتو ٹھہرو، شبِ وعدہ گزر جانے تو دو

بس لگا ہو تم نے پہنچایا پیامِ وصل ہی ۔۔۔ کچھ دہانِ تنگ سے اُن کو بھی فرمانے تو دو

جان ہی سمجھو اسے میری مگر ٹھہرو ذرا ۔۔۔ ایک ہی ارمان باقی ہے نکل جانے تو دو

کانٹے ہی کانٹے بچھیں بستر پہ مانا تو سہی
آرزو کا ایک کانٹا دل میں چبھ جانے تو دو

۲۹۔ "بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا"

اکتوبر ۱۹۱۸ء

یہ کیا کہ ہو گئے بیگانہ سلوکِ وفا ۔۔۔ یہ کیا، نباہ کے وعدے کی بھی نہ یاد رہی

کسی کی جان پہ بن جائے گی نہ یہ سوچا ۔۔۔ ذرا نہ رحم کیا تم نے وائے بے دردی

بتاؤ تو کوئی میرا قصور، میری خطا ۔۔۔ یہ بے گناہ کی بے کس کی کیوں دل آزاری

یہی کہو کسی مجبور پر ستم ہے روا — چلو طریقِ وفا سے تم آشنا نہ سہی
نہیں تمھی کو خبر، نہیں تھی تمہیں مری پروا — مگر ضرور تھا، لازم تھا پاسِ خود داری
خیال چاہئے تھا کچھ شکستِ پیماں کا — نہ تھا، بلا سے نہیں تھا لحاظ دل شکنی

چہ اعتبار قرارِ ترا و عہدِ ترا
"زما گسستی و با دیگراں گر دبستی"[۵]

تمہارا حال یہ ہے، اور مری یہ دہ دلی — سوا تمہارے کوئی مدعا نہ کوئی دعا
تمہارے قدموں میں دنیائے آرزو میری — تمہاری ایک نظر کائنات و مافیہا
ہے غایتِ تپشِ طلب شوقِ جاں بازی — نہایتِ خلشِ مدعا ہے پاسِ وفا
میں چاہتا نہیں تم سے جزا محبت کی — مگر قرارِ وفا ہے جب اس قدر بودا
تو اب ادھر سے بھی پھیر و نگاہ مہر اپنی — مری طرف ہو وہی التفات پہلا سا
فروغِ دیدہ ہو صورت تمہاری ایسی — تمہارے جلوے سے ہو دل کے آئینے میں جلا
رسیدہ کار بہ جاں کے، نگر بہ من آئی — "بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا"[۶]

---

[۵] حضرت غالب مغفور

[۶] حضرت غالب مغفور

۳۰۔ غزل

نومبر سنہ ۱۹۱۸ء

ثابت ہو دردافزا جب اُن کی دل نوازی
بے کار ہے عبث ہے، پھر سعیِ چارہ سازی

تا صبحِ شامِ فرقت، کیا ختم ہی نہ ہوگی
میعادِ زندگی میں اتنی کہاں درازی

مفہومِ حُسن و اُلفت کچھ بھی نہیں مگر ہاں
میری نیازمندی، یا اُن کی بے نیازی

اے کاش میری حسرت اک مدعا ہو اُس کا
مشکل کی جستجو میں ہے جس کی کارسازی

یہ چھیڑ ہے کہ پرسش، لو میں کہوں تو جانیں
میری الم نصیبی، اپنی ستم طرازی

دیکھی ہے کس نے اے دل صبحِ شبِ مصیبت
مانندِ شمع، ہو جا مصروفِ جاں گدازی

مانیؔ نہیں تو کیسا پھیکا ہے رنگِ گلشن
یعنی بہار کیا تھی!! اُس کی جنوں طرازی

۲۱۔ غزل

نومبر ۱۹۱۸ء

میان سے اُن کی تیغِ ناز، آہ نکل کے رہ گئی
عمرِ ابد کی آرزو، دل میں مچل کے رہ گئی

ہمتِ سعی کیا رہے، دل کا تو اب یہ حال ہے
آئی بھی جب کوئی اُمنگ، غم سے بدل کے رہ گئی

سینہ سپرِ اُمید تھی، ورنہ میں سخت جاں نہ تھا
تیغِ فراق مڑ گئی، روح سنبھل کے رہ گئی

صبح نے مبتلا کیا، پھر شبِ غم کے خوف میں
رات بھی میری زندگی، آنکھ بدل کے رہ گئی

مانیؔ مبتلا کا دل، کس لئے شعلہ زا ہے اب
ایک اُمید تھی سو وہ پہلے ہی جل کے رہ گئی

۳۲ - غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

اللہ آج بعدِ یک زندگی فرقت
کہتے ہیں آؤ پھر ہو تجدیدِ رسمِ الفت

بندہ ہوں میں تو یوں ہی کیوں دو فریبِ الفت
معلوم ہے تمہیں ہے مجھ سے بڑی محبت

آ ہی چکی مرے سر آنی تھی جو مصیبت
دل جوئیوں کی آخر اب اُن کو کیا ضرورت

چھوڑا مجھے انہوں نے، یہ راز کب کھلا ہے
جب روح نے بھی چھوڑی اے دل تری رفاقت

اے تو کہ پر ضیا ہے تجھ سے تمام عالم
آجا ادھر کہ میں ہوں محتاجِ شمعِ تربت

مر جاؤں گھٹ کے لیکن ضبطِ فغاں کروں میں
اب اس کی مقتضی ہے ظالم کی استراحت

میں جی رہا ہوں اب تک اس کی جواب دہ ہے
کچھ میری سخت جانی، کچھ آپ کی نزاکت

تقدیر میں تو یوں ہی مٹنا لکھا تھا میرا
تم نے عبث مٹا دی رسمِ خط و کتابت

کیوں سر جھکا ہوا ہے، کھوئے ہوئے سے کیوں ہو
فانی کی بزمِ غم ہے کیا عرصۂ قیامت

۴۳۔ سرما اور شبِ ہجر

دسمبر ۱۹۱۸ء

یہ سردیوں کا موسم، یہ ماگھ کا مہینا
راتیں بڑی بڑی یہ صبر آزمائے فرقت

سونا کہاں مجھے تو مشکل ہے آہ جینا
ناقابلِ تحمل، ہیں صدمہ ہائے فرقت

یہ بھی ہے زندگی کا آخر کوئی قرینا
اُف، ہر نفس ہے میرا ساز نوائے فرقت

گلزار بن گیا ہے داغوں سے میرا سینا
ہے روح محو سیر بستان سرائے فرقت

پر شور بحرِ غم ہے، اور زیست کا سفینا
زندان نصیب دل ہے، اور تنگنائے فرقت

نا معلوم

"اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد"

بھیگی ہے رات، لیکن آنکھیں ابھی سے ہیں تر
تا صبح آہ کتنا دل کا لہو بہے گا

دریائے اشکِ خونیں ہے موج زن برابر
طوفان یہ کیا تھمے گا، کھیتک ٹوٹ رہے گا

کٹ جائیں دکھ کی گھڑیاں، ایسا کہاں مقدر
غم جاں کا ہم نشیں ہے، کل سے کو یوں لٹے گا

اے کاش تن سے نکلے جانِ حزین و مضطر
دل ورنہ زندگی میں کیا خاک چین لے گا

اچھا، بسر کرونگا شب کروٹیں بدل کر
بس یا نصیب جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

دست از طلب نہ دارم، تا کارِ من بر آید"

لا نامعلوم

۳۴۔ غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

چلیں ساحل کو، جب یہ مشورہ میں نے کیا دل سے
کہا دل نے کہ ہیں ممتاز ہوں یارانِ ساحل سے

ستم سے مٹ چکا ہوں میں کرم کی اب ضرورت کیا
نتیجہ تم نے کیا سوچا ہی اس تحصیل حاصل سے

مجھے حق الیقین تھا کارفرمائیِ قسمت کا
مآلِ سعی مستغنی رہا اوہام باطل سے

سنور لو خوب جلدی کیا ہے، اب فرصت ہے
کہ وقتِ پرسشِ بیمار تو باقی ہی مشکل سے

دعائیں لب پہ، اور بابِ اجابت عرش پر آنی
مسافر رہ گیا تھک کر خیالِ بُعدِ منزل سے

۳۵۔ غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

ہو کیوں نہ بار یابِ اجابت دعائے شب
حامی رہے جو گریۂ تاثیر زائے شب

پھر موت کیا بری ہے، اگر زندگی ہیں ہو
فکرِ دوائے صبح و خیالِ دعائے شب

فرقت میں دن تو کٹ ہی گیا، رات ہی سو گئی
جو ہی خدا ہے روز، وہی ہے خدائے شب

دن بھر بس گھٹ دم جو نہ نکلا تو ایک بار
میں پھر کروں گا تجربۂ نالہائے شب

باقی کئی گھڑی تھی مرادوں کی رات جب
مانی نے جان دے کے ادا کی بہائے شب

۳۶۔ غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

یہ بند و بست بھی کچھ تو نے کر لیا صیاد
قفس میں آ نہ سکے باغ کی ہوا صیاد

خبر بہار کی لائی ابھی صبا صیاد
اب اور کیا کہوں بس یا نصیب یا صیاد

ارے میں زیبِ قفس ہی سہی، اگر پھر کیا
جو گھٹ کے آہ مرا دم نکل گیا صیاد

وہ سنگ دل نہیں، صورت یہ ہی کہ قصۂ درد
شروع میں نے کیا تھا کہ سو گیا صیاد

تجھے قفس پہ ہے قابو، مجھے تو دل پہ نہیں
میں کیا کروں کہ ہے گلزار کی ہوا صیاد

دراز عمرِ اسیری، کہ اب چھٹوں بھی تو کیا
چمن کا بھول گیا ہوں میں راستا صیاد

خوشی تھی میری اسیری تو موت کیوں غم ہے
کل آشیاں تو قفس آج اجڑ گیا صیاد

بس اور کیا ہے مجھے آشیاں نصیب ہو
کہوں جو چھٹ کے اسیری کا ماجرا صیاد

تھی ابتدائے بہاراں و فصلِ گل باقی
کہ آشیاں مرا برباد کر گیا صیّاد

۷۳۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۱۹ء

کب کہا ہم نے کہ پہلو میں ہمارے دل نہیں
دل تو ہے ہاں التفاتِ دوست کے قابل نہیں

سب ہوں لیکن کیا، اگر وہ زینتِ محفل نہیں
بزمِ جسمِ جاں ہے پھر کیا رہ گیا جب دل نہیں

آنکھ سے اوجھل ہی، لیکن جلوہ گر دل میں تو ہے
پردہ دارِ حسنِ جاناں پردۂ محمل نہیں

آرزو کو در پئے مقصود رہنا چاہیئے
آج اگر اک بات ہے، دشوار کل مشکل نہیں

پاسِ حکمِ دوست اب تو ہی بتا کیا چارہ ہے
ضبط کرنے پر تو راضی آج میرا دل نہیں

حشر کے دن میں الٰہی کیوں نہ وہ محجوب ہوں
میری جو دنیا کا غم گھڑیاں زیست میں شامل نہیں

یا دلِ دیوانہ ہے بے مقصد و بے مدعا
یا رہِ الفت میں اب آتی کوئی منزل نہیں

۳۸۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۱۹ء

پیش کر سکتے ہیں ہم گل کا گلستاں کا جواب
لائے کوئی گل عذارِ گل بہ داماں کا جواب

میرے رونے پر تبسم، نالۂ دل سے ڈرو
میں بھی رکھتا ہوں تمھاری برق خنداں کا جواب

سینہ زخموں سے یونہی معمور رہنا چاہیئے
پھر تو مانگے جس کا جی چاہے گلستاں کا جواب

زلفیں بل کھانے لگیں سُن کر سمجھتا ہوں کہ وہ
رکھتے ہیں کیفیتِ بختِ پریشاں کا جواب

ڈوبنا عالم کا کیا اچھا ہے مانی ورنہ ابر
ابر تو کیا دے گا میری چشم گریاں کا جواب

۳۹۔ تخمیس

(بر غزل حضرتِ غالبؔ مغفور)

جنوری ۱۹۱۹ء

وفورِ درد ہے، ہیں سیکڑوں تمنا زارِ بستر ہے　　خلش پروازِ حسرت دامنِ صد خارِ بستر ہے
بہت تڑپا ہوں اے دل، اب سکونِ کارِ بستر ہے　　تپش سے میری وقفِ کش مکش ہر تارِ بستر ہے

مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

محبت جس کی تابع ہو وہ کیا ہو اُن کی چتون ہے　　وفا کا جوش کیا ہو خانہ زادِ عشق پرفن ہے
جنونِ مضطرب کے لختِ دل کا نام شیون ہے　　سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے

دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

ہو اُن ایام پر حسرت جو صحت میں گنوائے ہیں　　معاذ اللہ کیا کیا اُن دنوں صدمے اٹھائے ہیں
نہ ہے قسمت کہ اب خونِ گذشتہ ارماں رنگ لائے ہیں　　خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو وہ آئے ہیں

فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

اجل ہو اصطلاحِ عاشقی میں نامِ تنہائی　　نہیں ممکن کہ جاں بر ہو سکے ناکامِ تنہائی
بیاں کس سے ہو رازِ حسرتِ انجامِ تنہائی　　بہ طوفاں گاہِ موجِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

بخوبی یاد باقی رہے گی یاد اُن لمحاتِ رنگیں کی ادا دیکھی تھی جب تزئینِ حسن و حُسنِ تزئیں کی
نظر میں ہے ابھی شوخی نگاہِ سحر آگیں کی ابھی آتی ہے بو بالش سے اُن کی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

پریشانی ہی فکر آنی بیمار میں غالب عجب تخفیف ہے بیچارۂ بیزار میں غالب
نہایت جاں گزا ہے دردِ قلبِ زارِ غالب کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب

کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۴۰۔ استغنائے نومیدی

مارچ سنہ ۱۹۱۹ء

یاد ایام کہ تھا دامنِ اُمید بکف روح تھی جامِ مئے عشرتِ جاوید بکف
رہتی تھی ہر شبِ ارمان سحرِ عید بکف آج دل داغِ تمنا سے ہے خورشید بکف

یعنی اب وہ سر و سامانِ مسرت نہ رہا قلبِ آرام کا شرمندۂ منت نہ رہا
سازِ ہستی میں مرے نغمۂ راحت نہ رہا ذائقہ زیست کا ممنونِ حلاوت نہ رہا

اب امید ہے باقی نہ تمنا باقی — حوصلہ کوئی نہ باقی نہ ارادا باقی

شورش و ولولہ دل میں نہیں حاشا باقی — بستر یاس پہ ہوں اور ہے مرنا باقی

ہے نہ کچھ اُن سے شکایت نہ مقدر سے گلا — کہ مرے ذہن میں ہے فلسفۂ مہر و وفا

ان دنوں گورِ غریباں سے ہے اکثر گزرا — مرقدِ فانیِ مرحوم کا دیکھا کتبہ

"دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

اب دل افروزیِ عشرت نہ بہم ہو نہ سہی — روح فرسائے اندوہ نہ کم ہو نہ سہی

نالہ میرا نہ حریفِ شبِ غم ہو نہ سہی — جورِ اُن کا نہ مبدل بہ کرم ہو نہ سہی

وقفِ بیداد رہوں دادِ محبت نہ ملے — نہ ملے آہ مجھے اجرِ مصیبت نہ ملے

دم نکل جائے جزائے غمِ فرقت نہ ملے — ہاں میں راضی ہوں صلہ کاوشِ الفت نہ ملے

زندگی موردِ صد کلفت و آلام رہے — حسرت و یاس نصیبِ سحر و شام رہے

ہاں مری روحِ وفا کوشِ غم انجام رہے — یعنی تقدیرِ محبت یونہی ناکام رہے

وہ مرے دردِ جدائی کا مداوا نہ کریں — فکرِ تسکینِ دلِ مضطرب اصلا نہ کریں

صرفِ عیسیٰ نفسی مجھ پہ گوارا نہ کریں — یہی اچھا کہ وہ بیمار کو اچھا نہ کریں

لب ہلیں شکر مسیحا میں، یہ دم بھی نہ رہا
ضعف یہ ہے کہ سر بارِ کرم بھی نہ رہا

۴۱- تخمیس

(بر غزلِ حضرت غالب مغفور)
اپریل ۱۹۱۹ء

جو ذرا بھی اُن پہ قابو، جو کچھ اختیار ہوتا
تو دلِ حزیں کا اپنے نہ یہ حال زار ہوتا
ہمیں کیا سکون ہوتا، ہمیں کیوں قرار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

دلِ اک اضطراب قائم ہی، تغیر اس میں کیسا
وُہی بے قراریاں ہیں وہی شورشِ تمنّا
ہمیں تیرے عہدِ الفت پہ وثوق ہی کہاں تھا
ترے وعدوں پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری بات کی حقیقت میں نہیں ہے شبہ اصلاً

تو وفا شعار بھی ہے، ترا قول بھی ہے سچّا

نہ ہو پھر وفا جو وعدہ تو قصور کیا ہے تیرا

تری نازکی تھی جاناں کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کہے گا کہے گا بے شک مجھے بد نصیب وہ تو

کبھی ٹیس کے مزے سے نہیں آشنا ہوا جو

وُہی جانے جس کے دل میں سر تیر چبھ رہا ہو

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بڑی غم کی داد دی، کہ بنے ہیں دوست ناصح

مرے دکھ کا پاس بھی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

یہ عجیب دلدہی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

دلِ زار و مضطرب پر یہ اثر ہوا الم کا
کہ بشکلِ قطرۂ خون مری چشمِ تر سے ٹپکا
یہ اثر تو کیا ہے آتا نظر اک عجب تماشا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

گلہ مندیوں سے اپنی دلِ زار منفعل ہے
سرِ قطعِ رنجِ الفت سے خجل بہت خجل ہے
یہ خبر نہ تھی کہ کلفت تو شریکِ آب و گل ہے
غم اگرچہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

جو کچھ آہ پیش آیا وہ غضب کا ماجرا ہے
کہ ہزار بار مر مر کے دلِ حزیں جیا ہے

جو گزر گئی ہے مجھ پر اُسے کون جانتا ہے
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

نہ ہی جیتے جی ہمیشہ یہی عشق میں تمنّا
کہ جہاں سے یوں گزرتے جو کوئی نہ جان سکتا
مگر اے نصیب یہ بھی نہ ہوا تجھے گوارا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

متضاد وصف اس کے ہیں زمانے میں ہویدا
وہ ہی اوّل اور آخر، وہ نہاں وہ آشکارا

ہے اگرچہ ذرّے ذرّے میں وہ نور جلوہ فرما
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ترے فیض سے جو آئی ہوا اثر زبانِ غالب

تو چھنگی حسد سے اکثر شعرا کی جسان غالب
ہے کلام پاک تیرا کہ خدا کی شان غالب
یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۴۲۔ جہانِ غم

مئی ۱۹۱۹ء

مری داستاں سرائی میں کہاں ہو وہ حلاوت
کہ نہاں تھا آہ جس میں کبھی رازِ خوابِ شیریں
کسی بزم کی ہوں رونق کسی دل کی ہوں مسرت
مجھے یاد ہی نہیں اب وہ ترانہ ہائے رنگیں
مرے نغموں کا یہ عالم مرے ساز کی یہ نوبت
نہیں ہوتے یک نفس بھی یہ حریف کبر و تمکیں
مری ذات سے مکدّر نہ ہو اک خوشی کی صحبت

وہ روشِ معاشرت کی نہ وہ زندگی کا آئیں
نہیں اُن کی بارگہ میں مری جا تو پھر گلا کیا
کہ خزاں رسیدہ پھولوں سے چمن میں مدعا کیا
نہ ذرا کروں گا پروا، مجھے حسرتیں ستائیں
مرا دل ہزار تڑپے نہ مناؤں گا کبھی غم
نہ کروں گا اُف، جو مطرب مجھے تہنیت سنائیں
کہ اُنھیں خوشی مبارک، مجھے حسرتوں کا ماتم
مجھے یہ ہوس نہ ہوگی کہ وہ بزم میں بلائیں،
کسی بے نوا نے دیکھا کبھی خواب محفلِ جم؟
نہ گلہ کروں گا اُن سے نہ کروں گا التجائیں
مگر اپنے آستاں سے نہ اُٹھائیں ہو کے برہم
بہ ملازمانِ سلطان[1] کہ رساند ایں دعا را
کہ بہ شکرِ بادشاہی تو زدر مراں گدا را"

---

[1] حضرت حافظ شیرازی مغفور۔

مجھے آہ یاد آیا وہ گیا ہوا زمانہ
کہ سرورِ عیش تھا جب مری زیست کی عبارت
نہ خلش تھی مدعا کی، نہ یہ کاہش تمنا
نہ یہ سوزشِ آرزو کی، نہ فسردگیِ حسرت
نہ سرِ ملال پیرا، نہ دلِ الم سویدا
نہ خیال غم تراوش، نہ جگر ستم جراحت
مگر اب تو کوئی دیکھے یہ نصیب کا پلٹنا
یہ ہجومِ یاس و حرماں، یہ وفورِ درد و کلفت
تو پھر اس سے کیا ہو مجھ کو، ہے دِ غم جہاں سے فرصت
کہ جہانِ غم ہے بانیِ قفسِ اسیرِ الفت

۴۳۔ مخمس

(بر غزل حضرت غالب مغفور)

مئی ۱۹۱۹ء

وہ ستم گار کہ بے میرے ستائے نہ بنے
میں وفا کیش کہ لب پہ گلہ لائے نہ بنے

اور تو اور زباں بھی تو ہلائے نہ بنے　　نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

قیس کے نالۂ شب کا تو سُنا یہ حاصل　　صبح کو نجد میں لیلےٰ تھی اور اُس کا محمل

یوں ہی آساں ہوا اے کاش مری بھی مشکل　　میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل

اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

نسبتِ باہمی قاتل و مقتول نہ جائے　　اُس کی سفاکیوں کی عادت مقبول نہ جائے

کم سے کم میری دل آزاری کا معمول نہ جائے　　کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنائے

بسکہ تھا ہاتھ دکھانے میں بھی رسوائی کا ڈر　　خطِ تقدیر بھی میں نے نہ سُنا پڑھوا کر

مجھ کو ناکامیوں میں بھی ہے یہ پاس اور اُدھر　　غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

وہ بڑے اہلِ مروت ہیں بڑے اہلِ وفا　　مجھ کو اُن سے نہ ستم کا نہ تغافل کا گلا

ہاں مگر ہے تو یہی نازک بدنی سے شکوا　　اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ہی جو سورج میں یہ آتش نظری کس کی ہی
ظلمتِ شام و ضیائے سحری کس کی ہی
یہ بساطِ فلکِ نیلوفری کس کی ہی
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہی
پردہ چھوڑا ہی وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

زخم کی خیر نہ مانگوں کہ سُتے اور بڑھے
لذتِ درد نہ چاہوں کہ ترقی ہی کرے
تربیت غم کو نہ دوں میں کہ نہ جائے ایسے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اُف نہ کی تھی کبھی اندیشۂ رسوائی سے
آج ممکن نہ ہوا ضبط بہے اشک بہے
عذر بھی اُن سے کروں اب تو وہ کب مانیں گے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

جب سے ہی شیفتہ شوخ پری وش غالب
زیست ہانی کی فقط نالہ ہی یا غش غالب
چارہ کیا ہی بجز اندوہِ کشاکش غالب
عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۴۴۔ غزل

جون ۱۹۱۹ء

آج تو ظالم کی آنکھوں میں مروت ہی نہ تھی
مجھ میں اور اُس میں کبھی جیسے محبت ہی نہ تھی

مرنے والے پر یہ تہمت ہے کہ اُلفت ہی نہ تھی
کہئے اُس کی زندگی کیا تھی، مصیبت ہی نہ تھی

وہ جو روٹھے ہیں تو میں نے سر قدموں پہ رکھ کر جان دی
اور تو کوئی منا لینے کی صورت ہی نہ تھی

اُن کی پلکیں تک نہ بھیگیں سن کے افسانہ مرا
یعنی گویا وہ محبت کی حکایت ہی نہ تھی

اب بھی اے واعظ وہی تخویف دار و گیر حشر
آپ کے نزدیک چال اُن کی قیامت ہی نہ تھی

آ کہ اب بس ہے امیدِ حشر دل اے شوق دید
زندگی میں تو غمِ ہجراں سے فرصت ہی نہ تھی

نام لوں کس کس کا اے آنی کہ عہد ہجر میں
اور دشمن بھی بہت سے ایک فرقت ہی نہ تھی

۴۵۔ کشمکش اُمید

جولائی ۱۹۱۹ء

جو ٹپک کے اشکِ خون نے کہا رازِ دردِ الفت
تو دھڑک کے قلب مضطر نے مرے یہ دی گواہی

یہ خلش کی لذتیں ہیں کہ ہیں رہبرِ تمنّا
یہ اُمید ہے کہ کرتی ہی خلش کی سربراہی
نہ اُمید ہی ٹلے گی نہ یہ کش مکش مٹے گی
مرے دل پہ حکمراں ہی جو یہی کرم نگاہی
رہوں ضبطِ غم میں کوشاں نہ فغاں کروں نہ روؤں
نہیں میرے بس کے اب تو یہ اوامر و نواہی
نہ مجھے قرار گھر میں نہ رسائی اُن کے در تک
نہ کہیں مرا ٹھکانا، میں کہاں رہوں الٰہی
مرے دل میں خاک اُڑتی ہی، یہ جانتا ہوں لیکن
نہیں جانتا کہ رونق کہوں اس کو یا تباہی
مجھے ظلمت و ضیا میں نہیں امتیاز باقی
میں نہ جانوں دن ہیں روشن کہ ہے رات میں سیاہی
ہے تمام دن تصوّر کہ وہ شاید آئیں شب کو
ہمہ شب دریں اُمیدم کہ نسیمِ صبح گاہی[۱]

---

[۱] حضرت حافظ شیرازی مغفور

بہ پیامِ آشنائے بنواز د آشنا را

۴۶۔ غزل

جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

عشرتِ عہدِ گزشتہ کو بس اب یاد نہ کر
اے دل اس طرح تمنا مری برباد نہ کر

کہنے سُننے سے خیالِ دلِ ناشاد نہ کر
جی میں جو ہے وہی کیوں اے ستم ایجاد نہ کر

حشر تک کے لئے خاموش ہوا وہ قیدی
کل جسے حکم دیا تم نے کہ فریاد نہ کر

ہم قفس ہاں اگر جائز نہیں ہیں بھی چپ ہوں
تو بھی اب ذکرِ خوشِ اخلاقیِ صیاد نہ کر

ہائے رونا تو ہی عادت تری اب اے مانی
کچھ نیا شیوۂ اظہارِ غم ایجاد نہ کر

۴۷۔ غزل

جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

تیری پرسش سے سکون ہوتا ہے اے قاتل بہت
ورنہ یوں تو شہر میں پرسانِ حالِ دل بہت

موت دے گی چپ کی داد اے آشنائے ضبطِ غم

اور تھوڑی سعی، اب نزدیک ہے منزل بہت
دل نہ دیکھا پھر جو تھا لیلےٰ کی گردِ راہ میں
یوں تو دیکھے نجد میں ناقے بہت محمل بہت
سنتے ہیں اعجازِ تسکیں آپ کے ہاتھوں میں ہے
ہم بھی دیکھیں گے تڑپتا ہے ہمارا دل بہت
ہم نے اپنی تجزیہ عمرِ محبت کا کیا
عنصرِ کاہش ہے اس کم بخت میں شامل بہت

۴۸۔ غزل

جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

بجا کہتے ہو تم بیجا تھی جو دل کو شکایت تھی
نہیں رنجش نہیں تمہیدِ تجدیدِ مسرت تھی
تلافی کی دمِ آخر کسی کو کیا ضرورت تھی
کہ میری موت ہی تنہا جزائے رنجِ الفت تھی
نہ پوچھو کیسی لذت آفریں ان کی محبت تھی

مصیبت جس کی راحت اُس کی راحت کیا قیامت تھی

فضا تھی سوگوار ایسی ہوا تھی بے قرار ایسی
اِنھیں کیا تھا، اگر تھی بھی تو میری شامِ فرقت تھی

چلو بھی کس لئے آنسو بہاؤ قبرِ عاشق پر
وہی تو ہے جسے تم سے تغافل کی شکایت تھی

حکایت آشنا سِ خوں کی جھوٹی لیکن اس کو کیا کہئے
کہ میرے ہر نفس میں آہ بوئے خونِ حسرت تھی

وفا کا ذکر سُن کر آج کتنے ہی بنی اُن کو
کہ مانیؔ کو خدا بخشے، وفا مانیؔ کی عادت تھی

۴۹۔ غزل

اگست ۱۹۱۹ء

کس کے سہارے رہیے، آہ امیدِ وصال
اب تو گزر ہی گیا، عہدِ سعیدِ وصال

ہو رمضاں سال بھر، شرط ہے اتنی مگر

یعنی کہ ہر روزے کے بعد ہو عیدِ وصال

دل پہ نہ معلوم کیوں لغزش ہوئی ورنہ تھی
عنصرِ روحانیت گفت و شنیدِ وصال

کاش کریں منحصر قتل مرا وصل پر
وعدہ نہ فرمائیں وہ بلکہ وعیدِ وصال

جینا تھا مانی تجھے اور بھی چند روز
اے وہ بہت کم سہی تھی تو امیدِ وصال

۵۰ غزل

اگست ۱۹۱۹ء

سخت جاں ہوں، دیکھیے حسرت یہ کیا بنتی ہے آج
ایک تو نازک ہے قاتل دوسرے نازک مزاج

جذبِ دل کو کہہ دیا معیارِ الفت اُس نے آج
اب خدا رکھے تو رکھے اُس کی خودداری کی لاج

نبض ڈھونڈھیں سر کو زانو پر جو رکھنے آئے ہیں

آہ دل جوئی کی اب باقی نہیں ہے احتیاج

کیسی صحت کی توقع، میں تو واقف ہوں کہ ہے

آپ کی چتون کی شوخی میرے دل کا اختلاج

وعدہ کر لو گے تو لازم ہو گی تکلیفِ وفا

کیوں مٹا ہی کیوں نہ دو تم عہد و پیماں کا رواج

۵۱۔ غزل

اگست ۱۹۱۹ء

کسے خبر کہ ہوا ہوں کب اور کہاں برباد

ارے کچھ آج سے ہوں کیا میں خانماں برباد

اب اور حشر میں کیا طرفہ ماجرا ہو گا

کہ آج بھی تو ہے حسرت کا اک جہاں برباد

نہ اُن پہ زور نہ دل بس میں وائے مجبوری

سکوت بے اثر و شورشِ فغاں برباد

کوئی بتائے کہ آبادیاں تھیں کب اس میں

تو میں بتاؤں کہ کب سے ہے آشیاں برباد

حیات و موت سے واقف نہیں مگر ہانی

کیا ہے مجھ کو محبت نے نوجوان برباد

غزل ۔ ۵۲

اگست سنہ ۱۹۱۹ء

جینے سے یہ بیزار مرا قلبِ حزیں ہے — دنیا کا ہے کیا ذکر غم اُن کا بھی نہیں ہے

کیا ہے کہ مجھے دیکھ کے کہتا ہے زمانہ — کچھ اور ہے اس کو غمِ دنیا تو نہیں ہے

تم ہو جو وفادار تو کچھ غم نہیں یعنی — اب جی سے گزرنا مجھے دشوار نہیں ہے

میں عہدِ وفا سن کے بھی رو دیتا ہوں لیکن — کیا سوچ کے روتا ہوں یہ معلوم نہیں ہے

ہاں موت تو آئے گی اگر چین نہ آئے

فانیؔ شبِ غم روزِ قیامت تو نہیں ہے

غزل ۔ ۵۳

ستمبر سنہ ۱۹۱۹ء

جی میں آتا ہے کہ روئیں اپنی بربادی پہ ہم

آہ، ہمیں کیا منائیں آپ کی شادی کا غم
کاش نکلے آپ کا ارمانِ عیشِ بے خلش
اور مرے سینے سے نکلے خارِ غم یعنی یہ دم
آہ میں مرجاؤں یا جی جاؤں اس سے بحث کیا
مقصدِ جاں جنبشِ لب ہی، کہو لا یا نعم
کچھ خبر ہے پاؤں میں زنجیر پہناتے ہیں لوگ
تیرے دیوانے کو دے دے کر ترے سر کی قسم
مانیِ ناکامِ حسرت کو بھی کر لیتے ہو یاد
سچ بتانا تم کو عیشِ کامرانی کی قسم

غزل ۵۴

ستمبر ۱۹۱۹ء

کیا کروں میں، ہو تو ہو اُن کو پریشانی بہت
مجھ کو بھی پیاری ہے اپنی نالہ سامانی بہت
زیست کی آسانیاں میرے لئے دشوار ہیں

مجھ کو ان دشواریوں ہی میں ہے آسانی بہت
خاک میں مجھ کو ملا کر آپ اتراتے تو ہیں

ہے ندامت خیز انجام ستم رانی بہت
میرے کہنے کی نہ پوچھو اپنے سننے کی کہو

ورنہ میری داستانِ غم ہے طولانی بہت
منہ سے کچھ کہتا تو سنتے، ہاں یہ دیکھا ہی ضرور

روٗ رہا تھا آج منہ ڈھانپے ہوئے ثانی بہت

۵۵- فریبِ وفا

ستمبر ۱۹۱۹ء

ہاں مجھے تم سے تغافل کا گلہ بیجا ہے — جب روا میرے لئے ظلم بھی بیداد بھی ہے
ہاں عبث محض عبث شکوۂ بے پروائی — جب کہ اک شان تمھاری ستم ایجاد بھی ہے
تم نہ گھبراؤ شکایت نہ کروں گا لیکن — یہ بتا دو مجھے، تم سا کوئی جلاد بھی ہے
تم نے جو درس محبت کا دیا ہی مجھ کو — محو کر دے اسے ایسا کوئی اُستاد بھی ہے
نقشِ باطل کی طرح آج مٹاتی ہو مجھے — ابتدا عہدِ محبت کی تمھیں یاد بھی ہے

مجھ کو گھر بیٹھے وہ پیغامِ تمنا دینا — یعنی موجود ہے شیریں کوئی فرہاد بھی ہے
مجھ کو لکھنا کہ تڑپتی ہوں تری فرقت میں — درد بھی دل میں ہے، لب پر مرے فریاد بھی ہے
آ۔ تری ناصیہ سائی کی تمناؤں میں — آستاں موردِ صد لرزۂ بنیاد بھی ہے
پھر مرے آنے پہ وہ شوقِ حیا کے انداز — تم وہ بلبل تھیں کہ جو قید بھی آزاد بھی ہے

مدعا ناز کا حسنِ طلب عرضِ نیاز
مقصدِ جلوہ کہ پھنک جائے مرے صبر کا ساز

گو خوش آیند تھا آغازِ محبت لیکن — فکرِ انجام سے پھر بھی میں پریشان ہوا
دل میں کہتا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے یارب — آہ، کیسا مرے مٹ جانے کا سامان ہوا
ساتھ ہی خطرۂ ناکامیِ الفت بھی رہا — کامیابی کا جو دل میں کبھی ارمان ہوا
اسی الجھن میں وہ گھبرا کے مرا لکھ دینا — خیر، وہ ہو چکا اب تک جو مری جان ہوا
خیریت ہے، ابھی چھوڑو مری الفت چھوڑو — تم اب صبر کرو، میں بھی پشیمان ہوا
ورنہ باور کرو تکمیلِ محبت کے بعد — حشر ہو جائے گا، دل میرا جو ویران ہوا
کیوں مری راحتِ دل، یاد ہی یا بھول گئیں — یہ لکھا میں نے تو پھر کیا مجھے فرمان ہوا
یعنی کیا کہتا ہے تو صبر کرو، للہ میں کیونکر — اہلِ الفت کو کہیں صبر کا امکان ہوا

تو نہ گھبرا کہ میں بیمار تری ہوں غلط تیری ہوں کیوں پریشان ہوا کاہے کو پشیمان ہوا

تھا یہ مطلب نہ تجھ ابلغ ٹالی ہو جائے

صید رنجور سے فتراک نہ خالی ہو جائے

بارہا جس کا یقین تم نے دلایا لیکن ہر گھڑی تھا وہی اندیشۂ انجام مجھے

یعنی کیا ہوگا اگر بڑھ گئی الفت میری اور تقدیر نے رکھا یونہی ناکام مجھے

الغرض چین نہ پاتا تھا یہ دم بھر دل زار آخرش پھر وہی دینا پڑا پیغام مجھے

پھر کہا میں نے کہ چھوڑو مری الفت چھوڑو کیوں بناتی ہو عبث مرکزِ آلام مجھے

نہ میسر ہو کہیں تلخی ناکامی عشق ہے گوارا جو ملیں زہر کے سو جام مجھے

تم جو ہنستی ہو یہ باور نہیں ہوتا مجھ کو اس تسلی سے تو ملتا نہیں آرام مجھے

باوجود اس کے مری ایک نہ مانی تم نے موردِ لطف ہی رکھا سحر و شام مجھے

رفتہ رفتہ وہی وقت آیا کہ اب جذبۂ ضبط ناشکیبائی کا دینے لگا الزام مجھے

مٹ گیا لوحِ دلِ غمزدہ سے صبر کا نام اسی فریاد سے تھا آگے یہ کام مجھے

سینہ ام ز آتش دل در غم جانانہ بسوخت[1]

---

[1] حضرت حافظ شیرازی مغفور۔

آتشے بود درین خانہ کہ کاشانہ بسوخت

بد سے بدتر ہوا جب حالِ دلِ خانہ خراب — میں نے کی عرض نہیں بس میں طبیعت میری

آہ میں جس کے تصور سے لرز جاتا تھا — دیکھتا ہوں کہ وہی ہو گئی حالت میری

یا تو آ جاؤ تم اب یا یہ اجازت مجھے دو — کہ چلا جاؤں جدھر لے چلے وحشت میری

یاد ہے یا نہیں کس درد سے لکھا تم نے — کہ نہ جا اور نہ کر ترک رفاقت میری

تو مجھے چھوڑ کے جاتا ہے مگر سوچ تو لے — کیا ترے ہجر میں ہو جائے گی نوبت میری

ہائے افسوس میں مٹ جاؤں گی مر جاؤں گی — تیرے صدقے نہ مٹا زیست کی صورت میری

جلد ٹل جاؤں گی تجھ سے میں ہمیشہ کے لیے — کہ تری ذات سے وابستہ ہے حسرت میری

چند ہی دن ابھی ان باتوں کو گزرے تھے کہ آہ — تم مجھے چھوڑ گئیں کیا کہوں قسمت میری

اب تو دل ہی گلۂ جور کا اک ساز خموش — اور زباں پر ہے یہ ناکامیِ ہمت میری

شربتے از لبِ لعلش[۱] نہ چشیدیم و برفت
روئے مہ پیکرِ او سیر ندیدیم و برفت

---

[۱] حضرت حافظ شیرازی مغفور۔

اب خدا کے لئے اتنا تو بتا دو مجھ کو — کیا جو کچھ عرض کیا میں نے غلط عرض کیا
یا خلاف اپنے کوئی بات چھپالی میں نے — یا کوئی امر بڑھایا جو موافق مرے تھا
بعد اس کے مجھے یہ اور بتا دو مری رُوح — سارے اس دور میں پاتی ہو کہیں میری خطا
تم نے جو حکم دیا اُس پہ کیا میں نے عمل — جو کچھ ارشاد تمھارا ہوا میں نے مانا
یہ حکایت ہے، اگر سچ ہے تو ذرا غور کرو — بے وفائی مری جانب سے ہوئی ہے کہ وفا
اور اگر جھوٹ ہی سب کچھ ہے تو جانے دو — تم یہ کہہ دو کہ غلط میں کہوں سچ تم نے کہا
بے وفا، ہرزہ درا اپنے کو تسلیم کروں — صادق القول تمھیں مان لوں اور اہلِ وفا
فیصلہ حشر میں ہو جائیگا اور جیتے جی — سعی ہوگی کہ زباں پر نہ فغاں ہو نہ گلا
اب رہا دل، سو یہ ہے اور رہے گا بیتاب — غالباً قبر میں بھی چین نہ لینے دے گا

[له] بعد مردن ز جفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

بعض اوقات سمجھ میں مری آتا ہی نہیں — کون سا نغمہ ہے غم اور خوشی ہے کیا ساز
تنگیِ قید ہو یا وسعتِ آزادی ہو، — ایک میں کیونکہ نہ گلشن ہے نہ تابِ پرواز

له نامعلوم -

آہ، اب کیا ہے، کوئی چند نفس باقی ہیں، | کہ پڑھیں صاحبِ دل میت عاشق پہ نماز
بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں ہمیشہ کے لئے | اُف، یہ خواب آور ہی زمزمۂ سوز و گداز
"ختم ہو اب اور بصد رنگ گلستاں ہونا" [۱] | مٹ گئی سادگیِ عہدِ تمنّا آغاز
تابو د نازکشِ حسن نیاز عشاق | شاہد ابادِ نزا سلسلۂ ناز دراز
میں تو ساکت ہوں کہ دم لینے کی طاقت ہی نہیں | دے رہا ہے دِل پُر جوش مگر یہ آواز
"عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است [۲] | حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز"
قصۂ عمر تو اب ختم ہے اے ماتی سُن، | فاش کر دے اسی قصے کے نتیجے میں راز

"دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا [۳]
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

۵۶ - آہِ نارسا

نومبر ۱۹۱۹ء

اے مربی احسنِ دل، ہیں متقاضی احباب | کہ سناؤں اُنھیں کچھ حالِ دلِ خانہ خراب

---

[۱] حضرت غالب مغفور [۲] نامعلوم [۳] حضرت غالب مغفور

ٹال دیتا ہوں میں سب کو یہی دے دے کے جواب
کیا کہوں آہ، کہ مجھ میں تو نہیں شرح کی تاب

کاش تم ہوتیں کہ یہ ذکر سناتا تم کو
لالہ زارِ دل پہ داغ دکھاتا تم کو

یوں تو اُلفت کے زمانے میں فسانے ہیں بہت
نغمہ ریزانِ محبت کے ترانے ہیں بہت
لیکن اک آہ میں دکھ مجھ کو سنانے ہیں بہت
جن کے سننے کو بھی غیر اور بیگانے ہیں بہت

تم مگر کاش یہ آہِ دلِ مضطر سنتیں
غم گساری نہیں، تفریح سمجھ کر سنتیں

لیکن اے جانِ تمنا تمھیں کیونکر پاؤں
کہ یہ افسانۂ اندوہ و الم دوہراؤں
دم کسی طرح نکل جائے کہیں مر جاؤں
آہ کیونکر دلِ حسرت زدہ کو بہلاؤں

کتنی مدت اسے گزری کہ جدا ہو مجھ سے
یہ بھی معلوم نہیں خوش کہ خفا ہو مجھ سے

ہاں تمھارا ہیں گنہگار ہوں اتنا تو ضرور
ضبطِ آثارِ محبت میں ہوا مجھ سے قصور
کچھ تو یہ بات ہے کچھ یہ ہے کہ اے غیرتِ حور
امتحانِ اثرِ حسن تمھیں تھا منظور

تم ہوئیں جلوہ نما برقِ تجلّی کی طرح

اور میں بے ہوش ہوا حضرت موسیٰ کی طرح

خیر ہیں واقفِ اسرارِ حقیقت ہی نہ تھا   دل مرا قابلِ انعامِ محبت ہی نہ تھا
یعنی کم بخت کو یارائے مصیبت ہی نہ تھا   ورنہ غم مقتضیِ شورِ قیامت ہی نہ تھا
ہاں تو پھر مجھ پہ یہ تجلی نہ گرائی ہوتی
آفتِ حسن کسی اور پہ ڈھائی ہوتی

کس کو منظور تھا برباد جواں ہو جانا   اک شگفتہ چمنِ دل کا خزاں ہو جانا
التجا کب تھی کہ یوں جلوہ کناں ہو جانا   برقِ سوزندہ پئے خرمنِ جاں ہو جانا
اور جو میں نے ارنی تم سے کہا بھی ہوتا
لن ترانی تمہیں کہنے میں تکلف کیا تھا

۵۷ تخمیس

(بر غزل حضرتِ غالب مغفور)

جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

جنابِ مشفق اس سے تو خالی نہیں   کہ تجربہ دستِ قیامت کی روداد نہیں

مگر میں حشر سے منکر ہوں، یہ مراد نہیں
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

فلک کے جی میں کچھ آج امتحاں کی آئی ہے
ذرا سی دیر کی یہ صبر آزمائی ہے
اداسیوں کی گھٹا کیوں دلوں پہ چھائی ہے
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

یہ حکم ہے کہ انھیں دشمنِ دغا نہ کہیں
عدو سے جان و دلِ اہلِ مدعا نہ کہیں
مگر یہ حال ہو اُن کا تو لوگ کیا نہ کہیں
کبھی جو سامنے آؤں تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اشک خوں کے بہتے ہیں
ہزار طرح کے غم اہلِ عشق سہتے ہیں
یہ رو رہا ہوں کہ یوں تو بھلائے رہتے ہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

مبارک اوروں کو امیدِ اجرِ یومِ حساب
مبارک اوروں کو دنِ ہجر کا صوم اور ثواب
یہاں غمِ مے کی کمی ہے نہ تشنگی کا عذاب
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

نہ چھیڑ تذکرۂ دفعِ گردشِ ایام — خوشی کا نام نہ لے ہم ہیں خوگرِ آلام

نصیبوں ہی میں ہی جب دکھ تو پھر کہاں آرام — جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نہ بلند آکرو کاہش میں ہیں جان کو غالب — بس اب سکوت میں ہانی کا ساتھ دو لب غالب

امیدِ عیش میں کیوں رنج مول لو غالب — تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

غزل ۵۸

فروری سنہ ۱۹۲۰ء

ناحق احبابِ منافق مرے بدنام رہے — خود یہ تقدیرِ محبت ہی کہ ناکام رہے

دم نکل جائے مگر دل یونہیں ناکام رہے — جی کی خاطر مری الفت تو نہ بدنام رہے

طول دے اور مری مدتِ غش کو یعنی — اور آغوشِ تجلی میں ترا بام رہے

دن پڑا ہے ابھی اور میں ہوں چراغِ سحری — منتظر کون ترے وعدے کا تا شام رہے

یعنی عاشق کوئی بقراط ہے ناصح کہ جسے — عہدِ آغاز میں اندیشۂ انجام رہے

کب میں سمجھا کہ سزاوارِ محبت ہی نہ تھا — جب نہ طاقت رہی دل میں کہ ناکام رہے

وقت آخر ہے، چلو دیکھ نہ لو مانی کو،
کہ جو مر جائے تو تقدیر پہ الزام رہے

۵۹۔ غزل

مارچ ۱۹۲۰ء

ہے بحث تو یہ کہ دل حریفِ بلائے اُلفت ہے یا نہیں ہے
نہ یہ کہ اُلفت مری قضا ہے تمہاری تیغِ ادا نہیں ہے

کبھی نہ بولوں گا، یہ تو میرے سکوت کا مدعا نہیں ہے
تری شبستانِ ناز ہے، کیا کہوں کہ روزِ جزا نہیں ہے

عبث بلا اپنے سر پہ لیتے ہو پابہ زنجیر کر کے مجھ کو،
ارے نکل جاؤں گا کہیں میں کہ تنگ ملکِ خدا نہیں ہے

نہیں، نہ سمجھو کہ میں بھی ہوں شان تمہارے فریادیوں میں شامل
مگر کہاں جاؤں عرصۂ حشر سے کہیں راستا نہیں ہے

گدا کو دم بھر میں یا الٰہی تو بخش دیتا ہے تاجِ شاہی
مجھے درِ مدعا عطا کر ترے خزانے میں کیا نہیں ہے،

اجل تو تھی ہی مگر تفاوت ہے فصل و فرقت کی جاں ہی ہیں

تم آگئے بس یہی تمنا تھی، اب کوئی مدعا نہیں ہے

نہیں ہو تم ملتفت ابھی اس لیے ہی دعوائے پاک بازی

وفا جسے کہہ رہا ہے مانیؔ، فریب ہے یہ وفا نہیں ہے

۶۰۔ غزل

جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

تجسس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دارِ امکاں میں

کوئی لمحہ خوشی کا آؤ ڈھونڈھیں عمرِ انساں میں

چراغ اک اُن کی محفل میں ہے اک میری شبستاں میں

یہاں تصویرِ مایوسی ہے، رونق بزمِ جاناں میں

جنوں کی یادگار اک آشیانہ ہے گلستاں میں

عبث تنکے چُنے تھے میں نے کیا فصلِ بہاراں میں

نہ ہوتا عشق سے مضطر تو کیا دل کو سکوں ہوتا

سکوں کا ذکر ہی کیا سایۂ گردونِ دوراں میں

کھلے ہیں پر، کھلا ہے در، مگر اب جب خزاں آئی
میں رکھتا ہوں قفس میں سر رہوں اب یا گلستاں میں

میں لیتا رخصتِ یک نالہ اور خاموش ہو جاتا
قفس اک بار اگر صیاد رکھ دیتا گلستاں میں

کبھی طرحِ دل آزاری تھی لیکن اب تو اے مانی
ادائے جاں نوازی دیکھتا ہوں دردِ ہجراں میں

۶۱۔ غزل

جولائی ۱۹۲۰ء

جب مکمل مری تسلیم کا قصہ نہ ہوا — تو بیاں آپ کی بیداد کا افسانہ ہوا

سرمہ ہو کر ہی سہی طور کی ہستی تو رہی — دل تو اتنا بھی حریفِ رخِ زیبا نہ ہوا

حاملِ ہمتِ مردانہ ہے تقدیر کہ دیکھ — آدمی بن کے رہا وہ کہ فرشتہ نہ ہوا

ہاں سنا خوب سنا تذکرۂ طور و کلیم — کیا کہوں ہائے مرا عہدِ تمنا نہ ہوا

اس خفیفت پہ یہ طوفان بڑی خیر ہوئی — کہ دل اک خون کے قطرے سے زیادہ نہ ہوا

زندگی بھر مری فریاد اب اُن کے آنسو — عشق کس حال میں کس عہد میں رسوا نہ ہوا

ساغرِ دیدۂ جاناں چھلک آئے باقی
آج لبریز مری عمر کا پیمانہ ہوا

۶۴۔ قطعۂ تاریخ

وفاتِ رفیقۂ حیات

مئی سنہ ۱۹۲۱ء

ماہ شعبان کی شبِ بست و یکم

۱۳۳۹ ہجری

عبث تھا میرے پاس غم سے ضبطِ دردِ پنہانی
گوارا تھی تمھیں جب اس طرح میری پریشانی
تمھارا ہر نفس جس کے لئے آغوشِ عشرت تھا
ہر اب آہوں کے گہوارے ہیں وہ میری تن آسانی
مری ہم عمر تھیں ہم راز تھیں ہم درد و ہم دم تھیں
یہ رشتے سب کے سب توڑے مجھے چھوڑا یہ کیا ٹھانی

بگڑنا کیا جو کچھ دن اور رہ کر ہم سفر ہوتیں

کہ میں بھی چھوڑنے کو تھا سرائے عالم فانی

ہوئیں تم رونق شہر خموشاں جب تو میں سمجھا

کہ اک بستی کی آبادی ہے میری خانہ ویرانی

عجب دلچسپیاں ہیں قبر پر ہر روز سنتا ہوں

یہ دل کا نغمۂ غم نوحۂ آرام روحانی

رفیقہ کی لحد ہے یا کہ یہ تصویر عبرت ہے

مرے ہی گھر کا یہ بگڑا ہوا نقشہ ہو ثانی

—— ۱۹۲۱ء ——

—— ۱۳۳۹ھ ——

۶۳- تخمیس

(برغزل حضرت غالب مغفور)

ستمبر ۱۹۲۱ء

آہ پامال ستم کیوں دل ناشاد نہیں میں تجھے یاد دلاتا ہوں اگر یاد نہیں

بخدا اور کوئی مقصدِ فریاد نہیں   نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

راہِ الفت میں ہے یہ مرحلۂ نو کیا خوب   مطلبِ غیر کی خاطر ہی تگ و دو کیا خوب
پھر یہ دعویٰ کہ ہے شیریں سے لگی لو، کیا خوب   عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

ہاں یہ سچ ہے کہ اگر عشق ہے وحشت ملزوم   اور وحشت کا ہے ویرانہ پسندی مفہوم
تو مرا گھر بھی ہے ویرانہ تفرج گہِ بوم   کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

کیوں کبھی غم، کبھی شادی، کبھی دن ہے، کبھی شب   انقلاب! بات یہ ہرگز نہیں بے وجہ و سبب
غور سے دیکھ کے ہر بات کا سمجھو مطلب   اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

میں تو چپ ہوں کہ نہ ہو جائے کہیں وہ رسوا   وہ سمجھتا ہے کہ یارا نہیں دم لینے کا،
مٹ گئی آہ امیدِ صلۂ صبر و رضا   وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ مجھے طاقتِ فریاد نہیں

کچھ نہیں، بادہ ہو ساقی ہو کہ مطرب ہو کہ نے — باتیں ہی باتیں ہیں رنگِ چمن نشۂ مے
کون کہتا ہے کہ دنیا میں بقا ہے کوئی شے — رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے

گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

قفس و قید کے آتے نہیں اس کو آئیں — نہ کوئی باغ میں بیٹھا ہے برائے تلقیں
شکر کر، بوئے گلستاں سے ہے کچھ تو تسکیں — سبزۂ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

ہاتھ ہر چند تمنائے دلی سے دھویا — لیکن انکار سے بھی خوش جو دہن کا جویا
یعنی کچھ بات تو کی، وہم تو دل سے کھویا — نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

مانتا ہوں کہ کہاں خلدِ بریں کی ہر خشت — جلوہ دارِ حرم و صومعہ و دیر و کنشت
پھر بھی انصاف کی یہ بات ہے اے حورسرشت — کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

واقعی بے وطنی بھی ہے مصیبت غالب — پوچھو آفی سے مگر اس کی حقیقت غالب
لاکھ زحمت ہو، سفر پھر بھی غنیمت غالب — کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

۶۴۔ چار بیت

جون ۱۹۲۲ء

لختِ دل کب تک سنبھالے جائیں گے
اشکِ خوں آخر بہالے جائیں گے

سانس گنتے عمر ہوتی ہے تمام | ہو رہا ہے خواب و خور مجھ پر حرام
دِل سے کب تک ہو گے تم زنداں کا کام | آہ کب ارماں نکالے جائیں گے

ترکِ اُلفت ہم سے ہو، کیسے کہیں | اپنی قسمت ہی کہ رنج و غم سہیں
حال یہ ہے، لاکھ ہم روٹھے رہیں | جب وہ آئیں گے منالے جائیں گے

ہو رہا ہے یونہی اک عالم تباہ | سرمگیں پھر کیوں ہوئی چشمِ سیاہ
کچھ سنوں میں بھی تو اے جادو نگاہ | ڈورے کس کے دل پہ ڈالے جائیں گے

آئے ہو کس کے مٹانے کے لئے | نقشِ حسرت، ہوں زمانے کے لئے
سرمۂ عبرت بنانے کے لئے | میری خاکِ اہلِ وفا لے جائیں گے

چونک اُٹھے فریاد کی آواز سے ۔ باہر آئے خواب گاہِ ناز سے
پوچھتے ہیں مانیِ جاں باز سے ۔ کیا فلک پر بھی یہ نالے جائیں گے

۶۵۔ غزل

جولائی ۱۹۲۲ء

نہ قفس ہی نظر آتا ہے نہ صیّاد مجھے ۔ کھینچ لائی ہے کہاں طاقتِ فریاد مجھے
کچھ نہ جز دید ملی روزِ جزا دادِ مجھے ۔ اُن کو دیکھا کہ ستم ہی نہ رہے یاد مجھے
لے وہ پتھر سہی، فولاد سہی اُن کا دل ۔ کہنے دی ہوتی ذرا ہجر کی روداد مجھے
حاصلِ ناصیہ سائی کسے معلوم نہیں ۔ سر اُٹھانے بھی تو دے لذتِ بیداد مجھے
کل گیا مردِ خدا توڑ کے زنجیرِ مجاز ۔ آج پھر قید ملا مانیِ آزاد مجھے

۶۶۔ غزل

جنوری ۱۹۲۳ء

غم ہوا دل سے نہ جاناں کے ستم سے پیدا
دل کی ہستی ہی ازل میں ہوئی غم سے پیدا

قول میں آپ نے جو بات نہ باقی رکھی،
پھر وہ کی جاتی ہے کیوں آج قسم سے پیدا

دیکھنے والوں نے کیا کیا نہ تراشی تہمت
کتنے طوفان ہوئے اک دیدۂ نم سے پیدا

گر گئے کچھ مرے پیمانۂ دل سے قطرے
انکشافات ہوئے ساغرِ جسم سے پیدا

شادنی کیا ہے، خدا جانے، مگر دل کا مآل
ہے ترے عیش میں پنہاں، مرے غم سے پیدا

ہم نہ تھے جب تو یہ تھی روح کے پردے میں نہاں
ہوئے پیدا تو محبّت ہوئی ہم سے پیدا

پوچھے مآنی سے کوئی طرفگیِ شانِ ستم،
اضطراب اُس نے کیا دل میں کرم سے پیدا

۶۷۔ غزل

جون ۱۹۲۳ء

کسے دعویٰ کہ جوشِ اشکِ خونیں سیلِ دریا ہے
یہ عالم ہے کہ اب دو آنسوؤں کا بھی توڑ ہونا ہے

سمجھتا ہوں کہ یہ اُس شوخ کا حُسنِ تقاضا ہے
یہ نوجانِ حزیں نذرِ نگاہِ بے محابا ہے

نہ تھا یوں مبتلا ہونے کا خطرہ آج سے پہلے
نہ یہ معلوم آگے چل کے دل کا کیا ارادا ہے

نہیں ہے جو مرے قابو میں، وہ ہے مدعا دل کا
نہیں جو بات میرے بس کی، وہ میری تمنّا ہے

محبت ہے، محبت میں کہاں دل سوز آئے گی
مصیبت ہے مصیبت کی گھڑی ہر اِک کہ آئے گا

۶۸۔ غزل

جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

تا صبح انتظار ہے اُن کا تو غم نہیں
منت کشِ سحر کبھی شامِ الم نہیں

احباب کو خوشی ہی کہ اب مجھ کو غم نہیں
روتے نہیں کہ دل ہی میں تابِ الم نہیں

مقصودِ نالہ خواہشِ ترکِ ستم نہیں،
تیزیِ ستم نہیں ہے خدا کی قسم نہیں

وہ وقتِ نزع آئے، مگر آخر آئے تو
ہو ایک دم کا عیش تو کیا مغتنم نہیں

مانی، وہ خوش جفا سے ہیں نادم اک آہ پہ
حالانکہ عرضِ حالِ محبت ستم نہیں

۶۹۔ قوسِ قزح

جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

رنگ بارش نے جما رکھا ہے اپنا دور دور
بڑھ رہا ہے آنکھ میں سبزے کے نظارے سے نور
میں یہ کہتا ہوں کہ آخر مے گساری کیا ضرور

کم نہیں برسات کی ٹھنڈی ہواؤں میں سرور
اندریں عالم پیئے جامِ شرابِ ارغواں
بادہ خواری کے شود مست کشِ پیرِ مغاں

ابرِ غم کو لے اڑی دل سے ہوا برسات کی
انبساطِ دل بنی ستھری فضا برسات کی
قوس میں پیدا ہے شانِ دل رُبا برسات کی
یا فلک پر ثبت ہے بانکی ادا برسات کی
یا مجھے خوش دیکھ کر مشقِ ستم کا جوش ہے
اور یہ چرخِ جفا پرور کماں بردوش ہے

دیکھ کر کل شام سے برسات کا جوشِ بہار
چھپ گیا تھا ابر کے پردے میں چرخِ زر نگار
مینھ نے دھویا ہے فضائے آسمانی کا غبار
تب ہوا یوں جلوہ گر مشرق کا زریں تاج دار
یونہی کیا اکلیل الماسی میں کم تھی دل کشی

اب تو ہالے سے دھنک کے اور زینت بڑھ گئی

میں یہ سمجھا جب مجھے قوسِ قزح آئی نظر

چہرۂ خورشید کی رنگینیاں ہیں جلوہ گر

پھر اسے نیرنگیِ افلاک کا سمجھا اثر

پھر خیال آیا کہ رنگیں ہفت قلزم ہیں، مگر

سات دریا مختلف رنگوں کے جب یک جا ہوئے

کیوں نہیں یک دل، یہاں قانون فطرت کیا ہوئے

آسماں نے یہ نمائش کی ہے گویا رنگ کی

کیسی لڑیاں جمع کیں گلہائے رنگا رنگ کی

اب زمانے میں کہیں ہستی رہے کیا رنگ کی

ہے محیطِ قوس میں محدود دُنیا رنگ

اِس کو مانی شانِ بوقلمونیِ صنعت کہوں

یا نگاریں حلقۂ آئینہ قدرت کہوں

۷۰۔ غزل

اگست ۱۹۲۴ء

پھر ایک دن تجھے اے برق میہماں تو کریں
مگر نیا کہیں تعمیر آشیاں تو کریں

یہ عمر ختم سہی، اور ایک عالم ہے
یہاں کا عہدِ محبّت وفا وہاں تو کریں

بیان ہو گا پھر اہلِ وفا کا افسانہ
تری جفاؤں سے آغازِ داستاں تو کریں

ہمیں پسند نہیں شکوہ کارفرما کا
وگرنہ ہم گلۂ جورِ آسماں تو کریں

ملا کے آنکھ نہیں روز آپ کہتے ہیں
جھکا کے آنکھ ذرا ایک بار ہاں تو کریں

عبث ہے موت کی میعادِ انتظار میں طول
نہیں تو آرزوِ عمرِ جاوداں تو کریں

تمام برق کی تابندگی کا چرچا ہے
کبھی یہ لوگ ذرا ذکرِ آشیاں تو کریں

یہ کوئی بات تھی، لیکن نہ ہو سکا ممکن
کہ قیس کو کبھی لیلےٰ کا ساربان تو کریں

عیاں نہیں، کبھی لطفِ نہاں تو ہو آنی
یقین نہ ہو تو محبت کا ہم گماں تو کریں

۷۱۔ غزل

ستمبر ۱۹۲۴ء

ہیں بخوبی آشنا رازِ حیاتِ دل سے ہم
دور دور اپنا سفینہ رکھتے ہیں ساحل سے ہم

پہلے ہی اس دن کا رونا سُن چکے ہیں دل سے ہم
جب تلاطم کا نظارہ کرتے تھے ساحل سے ہم

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب دل کھول کر نالے کئے
کھولتے ہیں اب تو آنکھیں بھی بڑی مشکل سے ہم

اپنی بربادی پہ رونا چاہئے ہم کو، مگر
رنج ظالم کی مسرت کا کریں کس دل سے ہم

یا وہ آکر تا دمِ آخر سرِ بالیں رہیں
یا پھر اُس وقت آئیں جب ہونے لگیں غافل سے ہم

زندگی سے موت تک ہے فاصلہ اک سانس کا
پھر بھی کیا معلوم کتنی دور ہیں منزل سے ہم

ہر گھڑی، ہر لحظہ لے آتی نئے انداز سے
اک صدائے آرزو سُنتے ہیں سازِ دل سے ہم

۷۲۔ غزل

دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء

وہ ہم پہ یہ ستم کر کے اور بھی بیداد کرتے ہیں
کہ ہم دادِ ستم دیتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں

اسیرِ آشیاں گم کردہ کو آزاد کرتے ہیں
کرم کرتے ہیں یعنی اک نئی بیداد کرتے ہیں

تمہاری وہ نظر جو اک تقاضائے تمنا تھی
تمہیں اب یاد کیوں ہوگی ہم اکثر یاد کرتے ہیں

وہ دل میں جلوہ فرما ہیں نگاہوں میں ہیں ظالم اُن کے
نہ اُن کو بھولتے ہیں ہم نہ اُن کو یاد کرتے ہیں

زمانہ چاہتا ہے نشرِ انجامِ محبت کا — بگولے اس لئے مٹی مری برباد کرتے ہیں
نہ ہی پروانہ کی طاقت نہ عادت فائدہ کیا ہے — اگر اب رحم فرماتے ہیں، اب آزاد کرتے ہیں

شکایت کس بنا پر ہو، گلہ کیا کیجئے مانیؔ
ستم یہ ہے کہ نادانستہ وہ بیداد کرتے ہیں

۷۳۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۴ء

کب فغاں با اثر نہیں ہوتی — اور کچھ ہے، اگر نہیں ہوتی
غم سے مانوس اگر نہیں ہوتی — تو وہ روحِ بشر نہیں ہوتی
ہاں قفس کی فضا میں اے صیاد — ہوسِ بال و پر نہیں ہوتی
آہ بن جاتی ہے نشیمن سوز — برق جب جلوہ گر نہیں ہوتی
جیسا روشن ترا تبسم ہے — ایسی روشن سحر نہیں ہوتی
دونوں راتوں میں عیش و غم کی مجھے — آرزوئے سحر نہیں ہوتی
اور کیسے ہو اب محبت ترک — چاہتا ہوں، مگر نہیں ہوتی
جب وہ بالیں پہ ہیں تو اب دُنیا — کیوں اِدھر کی اُدھر نہیں ہوتی

روتے کٹتی تھی زندگی ہائے
اب تو یوں بھی بسر نہیں ہوتی

۴۷۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

سُنئے نہ کچھ تو کہتے نہ کچھ اپنے جی سے ہم
پہلے تو ایسے تنگ نہ تھے بے کسی سے ہم

ہم کو غرض بہار و خزاں سے نہیں، مگر
محروم کیوں ہوں لذّتِ دیوانگی سے ہم

اک سیدھی راہ دل سے ملی تا رگِ گلو
اے خضر بے نیاز ہیں اب رہبری سے ہم

کیا جانو تم ہمیں، تمھیں ہم کیا سمجھ سکیں
نا آشنا ملال سے تم ہو، خوشی سے ہم

مشکل سے عہدِ یاس میں کھینچی ہے ایک سانس
ہیں صرف یادِ عہدِ تمنّا ابھی سے ہم

خود دار آپ یوں ہیں کہ رسوا نہ ہوں، مگر
مجبور ہو نہ جائیں کہیں بے خودی سے ہم

تم اور ہم ہیں رونقِ دُنیائے حُسن و عشق
تم اپنے اقتدار سے بے چارگی سے ہم

ناچار جیسے موت سے ہیں، بس اسی طرح
مجبور ہیں بہار میں دیوانگی سے ہم

ٹھوکر تو سر فرازیِ عشاق ہے مگر
ڈرتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے ناخوشی سے ہم

تابِ نظر کسے کہ سُنی ہے جو اک صدا
ہیں سر بر آستانِ پرستش اُسی سے ہم

جو دوستی کے رشتۂ نازک سے خوف ہے،
مانیؔ وہ خوف رکھتے نہیں دشمنی سے ہم

۷۵۔ غزل

مارچ ۱۹۲۵ء

وہ جلوہ گر ہیں پھر بھی ہے گلہ ہمیں حجاب کا
کہ تابشِ جمال کام دیتی ہے نقاب کا

وہاں تو ہر ادا میں مصلحت ہے، اور ہم کو ہے
سرور التفات کا، ملال اجتناب کا

سکونِ دائمی کا انتظار ہے یہ زندگی
صلہ ملے گا یعنی ہم کو دل کے اضطراب کا

تری نگاہِ لطف کے سوا اگر کچھ اور ہے
تو خلد میں بھی سامنا رہا اسی عذاب کا

۷۶۔ غزل

مارچ ۱۹۲۵ء

تجھے اے قیس، اک جلوہ نظر آتا تو ہے دل میں
پھر اب کیا بحث لیلےٰ گھر میں بیٹھی ہو کہ محمل میں

محبت بھی ہے، مرگِ ناگہاں کا شوق بھی دل میں
زرا دیکھو ہماری محویت، تحصیلِ حاصل ہے

الٰہی مشکلیں آسان کر اُس ذات کا صدقہ
زباں پر میری جس کا نام آجاتا ہے مشکل میں

کہیں پھینکو مجھے اُلفت ہیں، جب میں امن کھو بیٹھا
وُہی منجدھار کی موجوں میں ہے جو خاکِ ساحل ہیں

ادائیں اُن کی سب قاتل نہیں، ایسی بھی دیکھی ہیں
کہ پیدا روح میں بالیدگی ہو، تازگی دِل میں

یہ طرزِ ترکِ اُلفت، گوشہ گیرِ نا امیدی پر
نہیں یوں چٹکیاں لیتے نہیں دُکھتے ہوئے دل میں

مری ہر سانس گویا ایک گامِ سعی ہے ثانی
یہ میں جیتا نہیں، مصروف ہوں قطعِ منازل میں

۷۷۔ غزل

اپریل ۱۹۲۵ء

دُنیا کا غم دیا، دلِ غم آشنا دیا
قسمت نے یہ دیا ہے مجھے تم نے کیا دیا

بس اب نہ کہئیے آہ نے دل کو لا دیا
سمجھا میں آپ نے مجھے درسِ وفا دیا

یہ جان کر کہ صبر سے ہی میرے دل کو لاگ
مجھ کو فریبِ وعدۂ صبر آزما دیا

جب امتزاجِ عشق و وفا سے ازل کے دن
کچھ بھی نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

تقدیر نارسا تھی تو اے قاسمِ ازل
فانی کو کیوں نہ اک دلِ بے مدعا دیا

۷۸۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۵ء

نہ پوچھ اے نو اسیر، اب مجھ سے آثارِ بہاراں کو
ہوئی مدت کہ رو بیٹھا نشیمن کو گلستاں کو

نہ فرماتے اگر مجھ سے دریغ الطافِ پنہاں کو
تو میں نعمت سمجھتا آپ کے جورِ نمایاں کو

خزاں میں چاہیئے پیوند دامانِ بہاراں کو
جنوں نے پھاڑ ڈالا وقت سے پہلے گریباں کو

اہم ہے عالمِ امکاں کی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شے
دُعا دیتا ہے زنداں میں پیمبر چاکِ داماں کو

سُنا ہے جب سے نام انسانیت کا جستجو میں ہوں
وہ دنیا کس طرف کو ہے، جہاں پا جاؤں انساں کو

کہیں تو کون مانے گا کہ استغناءِ اُلفت نے
ہمارے سامنے ٹھکرا دیا ملکِ سلیماں کو

تمیزِ فقر و دولت اک جنونِ ہوشیاری ہے
ملا دیتی ہے ہشیاری جنوں کی جیب و داماں کو

نہیں جب ضامنِ اُلفت نگاہِ اولیں تیری
تو میں بھی رد نہ کر دوں دعوتِ تجدیدِ ایماں کو

یہی تو اک سہارا ہے مرا صبحِ قیامت تک
مری بالیں پہ جلنے دو چراغِ شامِ ہجراں کو

چلا ہیں، تم نہ آئے! آہ وہ ساعت کہ جب مجھ پر
تمنّا تنگ کر دے عرصۂ گورِ غریباں کو
مُسلّم حجرۂ زنداں کی آرائش گرانی
ہٹا دے نقشۂ آزادی و سیرِ بیاباں کو

۷۹۔ غزل

مارچ ۱۹۲۶ء

شوق دیکھو، خنجرِ قاتل جو عریاں ہو گیا
روح بن کر دل رگِ گردن میں پنہاں ہو گیا

جذبۂ دیوانگی زیبِ گلستاں ہو گیا
یا جنوں کا جوش ممنونِ بہاراں ہو گیا

ہر نفس ہے سعیِ آزادی میں اک دامِ امید
میں تو تھا ہی، دل بھی یوں پابندِ زنداں ہو گیا

کیا بہار آئے گی اب ہم نے تو دیکھا ہے کہ جب
آشیاں میرا لُٹا، گلزار ویراں ہو گیا

آخر اک مقصود میرا ابھی ہے، کیوں کافر ہوں میں
اور جو میں کافر ہوں تو کیسے مسلماں ہو گیا

ہاں، محبت راز ہے، کتنا اہم کیسا عظیم
یہ کمالِ سترِ پنہاں ہے کہ عریاں ہو گیا

دیکھ آئینہ ہے تیرے اقتدارِ حسن کا،
وہ زمین جس کا لقب گورِ غریباں ہو گیا

جلوتِ تصویر ہو یا خلوتِ تخئیل ہو
تو جب آیا اور جہاں آیا چراغاں ہو گیا

اوّل اوّل اک رگِ دل میری ساری روح تھی　　اب یہ عالم ہے کہ دل سارا رگِ جاں ہو گیا
اک خلش کی آرزو تھی جو مرا دل بن گئی　　ایک عنوانِ تعارف تھا کہ پیکاں ہو گیا

پردۂ دل میں تھا اے ماؔنی نہاں رازِ وجود
موت کیا آئی کہ اب وہ راز عریاں ہو گیا

۸۰۔ غزل

مارچ ۱۹۲۶ء

سہل نہیں کہ ہو شمار خلوتیانِ راز میں
زندگیاں گزر گئیں بے کسی نیاز میں

اُن کے قدم کو جنبشیں ہوں گی حریمِ ناز میں
قوتِ جذبِ التفات ہے جو سرِ نیاز میں

عشق گدائے حسن ہے حسن کو اُس کی احتیاج
کیا ہوا اگر گدا نہ ہو کوئے گدا نواز میں

خوب ہوا تم آ گئے، آہِ جگر گداز ختم
صرف کروں گا ایک سانس، نالۂ جاں نواز میں

عشق نے کس کی جان کی نذرِ وفائے کوہ کن
کس کو بنا دیا غلام بارگہہ ایاز میں

مجھ سے محبت آپ کی چھپ نہ سکی کہ فرق ہے
نالۂ حق نواز اور ضبطِ زمانہ ساز میں

مانیؔ سادہ دل نہیں فرق شناس کفر و دیں
سمجھا ہے کعبۂ یقین بت کدۂ مجاز میں

۸۱۔ غزل

اپریل ۱۹۲۶ء

وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکرِ نالۂ شب گیر سے
کیونکہ ناواقف ہیں ضبطِ آہ کی تاثیر سے

تھی ہی وابستہ تباہی عشق کی تقدیر سے
ورنہ میرے چارہ گر غافل نہ تھے تدبیر سے

حسن یہ صورت بنا سکتا ہے اک انسان کی
اُن کی قدرت بھی نمایاں ہے مری تصویر سے

بات کل کی ہے کہ اک پیکاں سے دل زخمی ہوا
آج میری آرزو مجروح ہے اک تیر سے

مسکرانا آپ کا یوں رونقِ صبحِ اُمید
شامِ غم کی جیسے زینت نالۂ شبگیر سے

سعی کی ناکامیِ پیہم سے یہ عقدہ کُھلا
لاگ ہے یعنی مری تقدیر کو تدبیر سے

اپنے مُنہ سے کیا کہے بانیؔ، مگر حق تو یہ ہے
کم نہیں اس عہد میں وہ میرزا[1] و میر[2] سے

غزل ۸۴

ستمبر ۱۹۲۶ء

مقدر جہاں ایک دن مجھ کو لایا، ملی تھی جہاں مجھ سے میری جوانی
وہیں سے ہی آغازِ عہدِ تمنا، وہیں ختم تھی دنیوی زندگانی

---

[1] میرزا غالب مغفور [2] میر تقی میر مغفور۔

یہ صبّاد ذکرِ بہاراں جو چھیڑا بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی
مگر اب یہاں دل بہلنے لگا تھا نہ تھی یاد مجھ کو چمن آشیانی

کہوں میں بہت کچھ، مگر فائدہ کیا، اگر آپ واقف نہ ہوتے تو کہتا
جو ہی آپ کے عیش و عشرت کا قصا وہی کی وہی میری غم کی کہانی

مسلم جو آثار تھے عاشقی کے وہ اے بے وفا تو نے باطل دکھائے
گلہ تجھ سے کیا ہو، دُعا ہے خدا سے کہ یارب مجھے موت دے ناگہانی

مبارک ہو اے طالبِ دید موسیٰ ضرور آپ کو آج دیدار ہو گا
یہ ہے ناز، یعنی نوازش کا وعدہ سمجھئے ذرا معنیٰ لن ترانی

یہاں تک بڑھی آپ کی بے وفائی کہ ڈالی مرے سر بلائے جُدائی
مگر خیر، جب یہ قیامت بھی آئی تو اب رہ گئی کیا مصیبت اُٹھانی

سُناؤں کسے آہ غم کا فسانا اِدھر کا اُدھر ہو گیا ہے زمانہ
ہے فرصت اگر اور رہا ہو ظلم ڈھانا غنیمت سمجھئے کہ زندہ ہے مانی

مسجع غزل، اور یہ خوش بیانی
زہے طبع موزوں کا حسنِ روانی

اب اک نظم سادہ کی صورت میں باقی
دلِ زار کی کیجئے ترجمانی

بقا صرف ذاتِ خدا کو ہے لیکن حقیقت میں دل بھی نہیں جزوِ فانی
کہ ہے نامِ دل اب بھی عالم میں باقی قیامت ہی تھا ورنہ سوزِ نہانی

محبت ہے اک عالمِ لم یزلی کہ قائم ہے تا محشرِ کامرانی
یہاں ہر نفس کوشش رازداری یہاں ہر قدم درپئے رازدانی

سراسر غلط ہے اسے ظلم کہنا، نہیں حکم تقدیر کا یہ تو کیا ہے
کہ اک آشیاں سوختہ کے قفس پر گوارا نہیں اُس کو بجلی گرانی

کہاں تک وجودِ خیالی ہمارا چھپے گا تہِ دامنِ رختِ ہستی
اسے ایک دن چاک ہونا ہے آخر عیاں ہو کے رہنا ہے رازِ نہانی

ذرا فطرتِ حُسن رکھئے نظر میں رہے شغل عرضِ تمنا کا موسیٰ
تقاضائے تکرارِ مطلب سمجھئے اگر التجا پر کہیں لن ترانی

مرے آشیانے کو ویران کر کے غنیمت بتاتا ہے جینا قفس کا
الٰہی کچھ ایسا ہو صیاد جس سے سمجھ لے کہ کیا چیز ہے زندگانی

غزل تو نے مآنی یہ ایسی پڑھی ہے
جسے سن کے دیوار و در وجد میں ہے
کچھ اب قافیے ہیں جوانی کے بھی کہہ
کہ ہے یہ زمانِ وداعِ جوانی

جوانی ہر انساں پر آتی ہے لیکن کہیں جنس ارضی کہیں آسمانی
جوانی مری حاصلِ کشتِ ہستی کہ ہے چشم بر راہِ برقِ جوانی
مسرت کی راحت کا اب ذکر ہی کیا الم ہے سو اُس میں بھی لذت نہیں ہے
اسی سے میں کم بخت یہ چاہتا تھا کہ جب موت آئے تو جائے جوانی
دلِ زار ہے اور آفت پر آفت کہاں ہے خدا اور تختِ عدالت
جوانی خود اپنی جگہ اک قیامت پھر اُس پہ قیامت حسیں کی جوانی
یہی شان ہو اُن کی روزِ جزا بھی کہ ٹھہرے تباہی مری حق بجانب
مجھے جس جوانی نے دنیا سے کھویا الٰہی رہے حشر تک وہ جوانی

فراغ اب اگر ہو بھی مآنی تو کیا ہے
قفس ہو، نشیمن ہو، سب ایک سے ہیں

خزاں آ گئی گلشنِ زندگی میں
چلی جا رہی ہے بہارِ جوانی

۸۲- غزل

نومبر ۱۹۲۶ء

وہی وہ وہی بزم، کیسے کہوں میں،
کہ جو کل تھا وہ رنگِ محفل نہیں ہے

یہ کہئے کہ سر میں وہ سودا نہیں ہے
یہ کہئے کہ پہلو میں وہ دل نہیں ہے

اسے طاقتِ ضبط کا ادعا ہے
وہ جلوے کی تابش کا قائل نہیں ہے

یہ باتیں ہیں، اور ان کا ہوش اس لئے ہے
کہ وہ زینت آرائے محفل نہیں ہے

ہے لیلےٰ تو محمل میں موجود، لیکن
جلو میں صدائے سلاسل نہیں ہے

نہیں ہے جو دیوانۂ نجد باقی
تو وہ شانِ دلچسپ محمل نہیں ہے
کرے سعی ہر چند سارا زمانا
نہیں دل کی قسمت میں آرام پانا
محالات سے ہے لکھے کا مٹانا
یہ کہہ تو ہاں تم کو مشکل نہیں ہے
کٹے کیسے ہستی کی راہِ مصیبت
کہ ہے ہر قدم کارزارِ محبّت
یہ مانا کہ انفاس کی کچھ حقیقت
بجز سعیِ قطعِ منازل نہیں ہے
یہ محشر کا مجمع ہے، میں چپ ہوں لیکن
خود انصاف سے آپ اک بات کہہ دیں
کوئی ذرّۂ کائنات جہاں ہے
کہ تصدیقِ بربادیِ دل نہیں ہے؟

اب آنکھوں میں آنسو نہ ہونٹوں پہ نالے
نہ ایذائے حسرت نہ کربِ تمنّا
فقط جذبۂ جاں نثاری ہے اور بس
کوئی شاہدِ ہستیِ دل نہیں ہے
کجا ناگہاں جل کے نابود ہونا
کجا برقِ سوزاں کا خوفِ نشیمن
لرزتا ہوں بیٹھا ہوا آشیاں میں
بلا سی بلا ہے جو نازل نہیں ہے
مرے بس میں دل ہے نہ دل کی تمنّا
مگر تم کو قدرت ہے، پامال کر دو
یہ سچ ہے کہ میرا دلِ بے حقیقت
تمہاری تمنّا کے قابل نہیں ہے
نہ پوچھو کہاں کا ہے قصد اور کیوں ہے
سکوں ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں مسلسل

بظاہر یہ نوبت جب نا ہے، لیکن
سُنا ہے کہ وہ بھی تو منزل نہیں ہے

جہاں محوِ ظاہر پرستی ہے مانیؔ
تو کچھ اہلِ دل سا تھا، لیکن تجھے بھی
زرا جوشش تائید حق کا نہیں ہے
زرا جرأتِ ردِّ باطل نہیں ہے

۸۴۔ غزل

نومبر ۱۹۲۶ء

داد خواہی کا مجھے حشر میں کیا ہوش نہ تھا
کیا کروں میں کہ مرا وعدہ فراموش نہ تھا

تھا وہ ناکام جسے ہوش میں دیکھا یعنی
جس نے دیکھی تھی جھلک تیری اُسے ہوش نہ تھا

لیلیٰ و قیس کی تقدیر تھی شہرت، ورنہ
وہ ستم کیش نہ تھا، یا میں وفا کوش نہ تھا

عشق، اور طاقتِ دیدار؟ مگر اے موسیٰ
قبل اظہارِ تمنّا بھی تمھیں ہوش نہ تھا

آج کچھ بادۂ دوشینہ میسر آئی

کل جو میخانے میں باقیِ بلانوش نہ تھا

غزل ۸۵

اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

بجلی مضطر ہی کہ ٹوٹے کسی کاشانے پر — لکھ نہ دوں منتظرِ برق سیہ خانے پر
کاش مجنوں کو مجنوں ہی کہتی دُنیا — تہمتِ عشق لگا دیتے ہیں دیوانے پر
شدّتِ آرزوِ دید کا دیتا ہے ثبوت — دم آنکھوں سے نکلنا ترے آجانے پر
میری غربت سے نہیں اہلِ وطن خوش کہ ابھی — برق ٹوٹی نہیں اُجڑے ہوئے کاشانے پر
اب ہیں بشاش یہ سُن کر کہ وہ قصہ تھا مرا — شب کو آنسو نکل آئے تھے جس افسانے پر
پھر یہ جی میں ہی کہ بنیادِ نشیمن رکھ دوں — پھر کروں برق کو مجبور تڑپ جانے پر

داغِ بربادیِ حسرت کا ہے دل میں بانی
دیکھ لو شمع نہ دیکھی ہو جو ویرانے پر

غزل ۸۶

جون سنہ ۱۹۲۷ء

خم ہی سر شرمِ جفا ہی میری حالت دیکھ کر — با تاسفِ تنگیِ وقتِ عیادت دیکھ کر

حسن کے جادو سے بچ کر بھی ہیں آخر مٹ گیا
بے وفا کا حسن کا اظہارِ محبت دیکھ کر

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو بھی، چلے جانا ابھی
انتہائے آرزو، انجامِ الفت دیکھ کر

شکر ہے مجھ سے بھی وابستہ ہے کچھ ان کی خوشی
یعنی ہنس لیتے ہیں وہ میری مصیبت دیکھ کر

دے دیا فطرت نے دل کو آج اذنِ بیخودی
ہوشیاری کو خلافِ شانِ الفت دیکھ کر

ایک ہی منظر کہاں تک بند کر لی میں نے آنکھ
زندگی یعنی یہ تمہیدِ قیامت دیکھ کر

وسوسوں سے اور بھی آنیؔ کا دل ہے بے قرار
اے وفا دشمن، تری چشمِ مروت دیکھ کر

۸۷۔ غزل

فروری سنہ ۱۹۲۸ء

وہ بھی ہیں جنھیں عشق سے کچھ کام نہیں ہے
فطرت کا یہ انعام مگر عام نہیں ہے

تسکین کا محبت میں کہیں نام نہیں ہے
آسودہ نہیں وہ بھی جو ناکام نہیں ہے

بے دردیِ دل، اور پرستاریِ معبود
وہ کفر نہیں ہے تو یہ اسلام نہیں ہے

بجلی تو نشیمن پہ نہ گرتے ہوئے دیکھی
یہ تو ہے قفس میں، اگر آرام نہیں ہے

آرام سکوں میں ہے، سکوں موت میں یعنی
جینے میں تو ظاہر ہے کہ آرام نہیں ہے

نظارے سے ہاں اور بھی دل ہوتا ہے مضطر — بے آپ کے دیکھے بھی تو آرام نہیں ہے
وعدہ نہ رہا یاد تو مجھ کو بھی بھلا دو — اب میرے مقدر میں کوئی شام نہیں ہے
ہے میری محبت ہی تری نازشِ خوبی — مستغنیِ آغاز یہ انجام نہیں ہے

مانی نہ ہو محرومِ غمِ عشق الٰہی
بیچارہ حریفِ غمِ ایام نہیں ہے

۸۸۔ غزل

مارچ ۱۹۲۸ء

عزلتِ یاس میں کہاں اب وہ جنونِ زندگی
مضطربانِ آرزو، یہ ہے سکونِ زندگی
قصہ تمام کر دیا موت نے وہمِ زیست کا
جز و فسانۂ فنا تھا ہی فسونِ زندگی
وصل میں ہو سکونِ دل ہی یہ امیدِ مضمحل
جب کہ ہو عشق مستقل دردِ درونِ زندگی
جس کی ہر ایک سانس ہی جانِ ہزار اضطراب

یاس کا وہ طلسم ہے عہدِ سکونِ زندگی

ناخوش اُسے کریں تو کیوں زیست کی نامرادیاں

جس کی جبیں پہ لکھ گیا "سیدِ زبونِ زندگی"

پھر کبھی دیکھئے گا آپ حسنِ بہارِ آرزو

شوخیٔ رنگ ہے ابھی تشنۂ خونِ زندگی

دیکھئے نقش خامۂ مانیٔ باکمال کے

پیش نظر ہے منظرِ بوقلمون زندگی

۸۹۔ غزل

اپریل ۱۹۲۸ء

ہوئی ہے چارہ سازی منحصر دیدارِ جاناں پر

مشیت ہنس رہی ہے قسمتِ بیمارِ ہجراں پر

یہ عالم بے پر و بالی کا، یہ پرواز کی ہمت

قفس کو لے کے جا بیٹھا ہوں دیوارِ گلستاں پر

ہیں شایانِ ملامت تھا، مگر واعظ قیامت میں

غرورِ اتقا کو رشک کیوں ہو شرمِ عصیاں پر

مری اک سانس پہ ہے منحصر ہنگامۂ ہستی
بیاباں گردشوں میں ہے سرِ خارِ مغیلاں پر

کرم اے عشق پیدا ہو چلا ہے سرمدی نغمہ
ابد تک زخمہ زن رہنا یونہی تارِ رگِ جاں پر

زلیخا عصمتِ دیوانگی تیری مسلم ہے
کہ ہے پیوندِ دامانِ بنی چاکِ گریباں پر

ہے خاکا خوب اے آثیؔ، مگر بس جان پڑ جاتی
جنوں کا رنگ چڑھ سکتا جو تصویرِ بیاباں پر

۹۰۔ غزل

اگست ۱۹۲۸ء

کی موت نے پیدا اک تسکین کی صورت کی
ملنی تھی جزا آخر، آلامِ محبت کی

کٹتیں ہی نہیں گھڑیاں، اُف روزِ قیامت کی

تعبیر کہاں نکلی، خوابِ شبِ فرقت کی
اللہ کوئی حد ہے اُس دردِ محبت کی

تسکین جسے بخشے، امیدِ قیامت کی
اس یاس کے عالم میں، وہ آئیں کہ موت آئے

اب دل میں ہے گنجائش صرف ایک مسرت کی
ہر رنگ قیامت ہے انجامِ تمنّا کا

حسرت تھی بہت مجھ کو ظالم کی عنایت کی
آئینہ ہے، ہم تم ہیں، لو شان ملالو اب

بے رنگیٔ فطرت سے، نیرنگیِ فطرت کی
میں نزع میں ہوں اور وہ مصروف خود آرائی

اے حسرتِ نظارہ سب باتیں ہیں فرصت کی
اب دید کہاں ہوگی، دنیا میں کہ محشر میں

مدت تو بتاتا جا ظالم غمِ فرقت کی
پہنچوں گا وہیں میں بھی، ہر چند کہ اے آنی۔

تو کعبے چلا، میں نے بُت خانے کی نیت کی

۹۱۔ غزل

اگست ۱۹۲۸ء

وہ خود آج آمادۂ امتحاں ہے ۔۔۔ مگر آسماں سے بھی اب بدگماں ہے

جدائی میں ویران سارا جہاں ہے ۔۔۔ زمیں پر بس اب میں ہوں یا آسماں ہے

مری فہم کو تیری باتیں خموشی، ۔۔۔ ترے وہم کو میری چُپ داستاں ہے

سمجھیے شہود اس کو یا غیب کہیے ۔۔۔ محبت عیاں ہے، محبت نہاں ہے

غمِ برق و صیاد و گُل چیں مُسلّم، ۔۔۔ مگر کیا کروں، آشیاں آشیاں ہے

بس اب چُپ ہو صیاد میں مانتا ہوں ۔۔۔ قفس میں بھی گنجائشِ آشیاں ہے

الٰہی مجھے موت خاموش کر دے ۔۔۔ کہ پھر آج تاکیدِ ضبطِ فغاں ہے

بڑھے حشر سے کون اک منزل آگے ۔۔۔ کہ جنّت نہیں ہی اگر تو یہاں ہے

مگر تو بھی ننگِ محبت ہے فانیؔ

کہ اب تک تجھے ہوشِ ضبطِ فغاں ہے

۹۲۔ غزل

ستمبر ۱۹۲۸ء

نہیں سُنتے ہم، نہ سنیں، اگر ہے صدا تو پردۂ ساز میں
نہیں دیکھتے نہ سہی، اگر ہو اثر تو دل کے گداز میں
وہی اک حقیقتِ عشق ہے، جسے حُسن کہئے مجاز میں
کہ کرشمے ناز کے دیکھئے گا فقط جوابِ نیاز میں
ترے دشمن اور ترے دوست کے لئے قہر و لطف ہوئے ہوئے
شقِ رودِ نیل ہے مصر میں تو شگافِ کعبہ حجاز میں
نہ تمیزِ کلفت و عیش ہے نہ حسِ ملال و سرور ہے
کہیں ایسی حالتِ دل کو کیا جو نہ سوز میں ہو نہ ساز میں
مجھے دیکھ لیجئے اک نظر میں یہ چاہتا ہوں کہ دیکھ لوں
سیہ و سپید زمانہ آپ کی چشمِ شعبدہ باز میں
میں وہ ہوں کہ رہِ رو عشق کو نہ رہی ضرورتِ رہ نما
کہ ہیں میرے سجدۂ بے خودی کے نقوش راہِ نیاز میں

جو صنم بھی پوج تو دل سے پوج، یہ کیا ہی مانی بے یقیں
نہ خلوص تیرے سجود میں، نہ رجوع تیری نماز میں

غزل ۹۳

اکتوبر ۱۹۲۸ء

قصد و تصور، یعنی راہِ طلب کے مبادی کچھ بھی نہیں
سرحدِ ہوش سے آگے بڑھ، یہ جذبِ ارادی کچھ بھی نہیں

اے گوشہ نشینِ یاس، اے دل، اے محوِ فریبِ آزادی
ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے بندِ وفا، یہ تو آزادی کچھ بھی نہیں

راہِ غم اور قافلۂ دل، کس کو خبر ہے منزل کی
شورِ جرس، آوازِ حدی خواں، بانگِ منادی کچھ بھی نہیں

نادیدہ سکونِ ساحل ہوں، مانوس بہ آغوشِ طوفاں
میں نابلدِ آبادی ہوں، میری بربادی کچھ بھی نہیں

ہستی کو عدم جس صورت میں حاصل ہو وہی پائندہ ہے
یعنی شکلِ ثباتِ خوشی، جز مرگ شادی کچھ بھی نہیں

دردِ نہاں ظاہر ہو تو کیونکر، آہ کی آوازیں سن کر،
میں نے سوال کیا، کیا گزری، دل نے صدا دی کچھ بھی نہیں
اب کیا پرسش ہے دل تڑپا، آنسو ٹپکے دیکھ لے فانیؔ
میری کہانی اس کے سوا جو تجھ کو سنا دی، کچھ بھی نہیں

۹۴۔ غزل

نومبر ۱۹۲۸ء

لایا ہے بام پر اُنھیں جذبہ جواب کا — افسانہ سن لیا ہے زلیخا کے خواب کا
محشر میں کیا شمارِ جرائم سے مدعا — یعنی حساب ہو کرمِ بے حساب کا
بجلی گرے، اگر میں تغافل کہوں اُسے — تمکیں، جوابِ صاف تو ہے اضطراب کا
آبادِ عالموں کو قیامت مٹائے گی — کیا حشر ہو گا اس دلِ خانہ خراب کا

یہ زندگی ہے ہستِ نما و فنا مآل
فانیؔ، نظر میں ہی مرے عالم سراب کا

۹۵۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۵ء

رائگاں ظلم ترا، اے ستم ایجاد نہیں
یہ فغاں کیا ہے جفاؤں کی اگر داد نہیں

مجھ کو منظور کہ ہو شرمِ جفا عذرِ کرم
یہ ستم کیسے اٹھاؤں گا کہ بیداد نہیں

سانس ہر سانس ہے معمورۂ صد حسرتِ دل
کون کہتا ہے کہ راہِ عدم آباد نہیں

انفاس
وعدہ کیوں مان نہ لوں فرصت ہی کہاں
اب کہ ہیں نزع میں ہوئی نہ کہو یاد نہیں

حاصلِ زندگیِ عشق ہے اک درسِ فنا
اور کچھ اور ملا ہو تو مجھے یاد نہیں

تیری رحمت کہ رہی فطرتِ انساں آزاد
میری ہمت کہ ہیں با ایں ہمہ آزاد نہیں

جراتِ شکوہ ہے آفی تو شکایت باطل
جرات افزا جو ہو، وہ ناز ہے بیداد نہیں

۹۶۔ غزل

جنوری ۱۹۲۹ء

جادہ پیمائے تمنا ابھی آجا ہوش میں
دیکھ پروانے کی منزل شعلے کے آغوش میں

دل سے کیا ممکن نہیں دیوانگی کے جوش میں
فصلِ گُل قدموں میں ہے، دل ہے اگر آغوش میں

اک نظر تھی نقطۂ آغاز و انجامِ حیات
فکرِ فردا بھی ہے یعنی محو، یادِ دوش میں

کون ہو پھر داخلِ ہنگامہ زارِ ہوش و عقل
کون بے ہوشی کی راحت پا کے آئے ہوش میں

دیکھنا غفلت سمجھتے ہیں اسے عینِ خرد
عقل ہو جاتی ہے جب گم، اعتبارِ ہوش میں

کون جانے کیا ہے حدِّ انتہائے بیخودی
ابتدائے بے خودی تھی انتہائے ہوش میں

ہے مجھے ناکام ہی مرنا، کہ آنی ہے ابھی
ایک ناوک، ترکشِ چرخِ کماں کے دوش میں

۹۷- غزل

مارچ ۱۹۲۹ء

آسمانوں میں تو چکر بر سبیلِ دام ہے
ورنہ جو کچھ ہے وہ میری گردشِ ایام ہے

میری بربادی، مرے احساسِ غم کا کام ہے
ہوش نے غارت کیا، دیوانگی بدنام ہے

جاں فزا، جاں سوز، دل کی موت، دل کی زندگی
منظرِ اضداد ہے، جس کا محبت نام ہے

زندگی ہر حال میں ہے ایک دردِ مستقل
اور دوا اس کی محبت ہے، اگر ناکام ہے

وہم آغازِ خرابی سے تھی غم کی ابتدا
انتہائے غم یقینِ خوبیِ انجام ہے

خوئے غم سے غم میں لذت، لذتوں میں زندگی
کوئی کیا سمجھے کہ میری زندگی ناکام ہے

صبر کے خرمن پہ اے مانیؔ جو یہ بجلی گری
اک بلا ہے جس کا امید ایسا پیارا نام ہے

۹۸ غزل

اپریل ۱۹۲۹ء

مراد ہم تو میری آنکھوں میں نظر کا ہم نشیں ہے
یہ غلط کہ وقتِ آخر کوئی آرزو نہیں ہے

یہ ہے شانِ آستاں کی کہ ہے سجدہ گاہِ عالم
یہ فضائے دل کی وسعت، کہ وہ آستاں یہیں ہے
مرا دردتم نے پوچھا، تو میں درد اب کہوں کیا
کہ حریفِ لطفِ پرسش مرا درد ہی نہیں ہے
تری جو نگاہِ اوّل، مری ابتدائے غم تھی
خبر اُس کی ہی جو میری یہ نگاہِ واپسیں ہے
وہ ازل ہو یا ابد ہو، یہ جبیں ہے اور سجدہ
کہ فنا کا بابِ آخر، یہی درس اولیں ہے
یہ نہیں کہ میرے دل کو نہیں ذوقِ شکوہ سنجی
مرے ذہن میں گلے کی کوئی بات ہی نہیں ہے
مری زیست کا مقدر تو ازل سے ہی مقرر
تری اک ادا پہ مٹنا، وہ ادا جہاں کہیں ہے
نہ جھکے اگر مرا سر، تو مری خطا ہے ورنہ
یہ جو نقشِ پا ہے تیرا یہی نقشِ ہر جبیں ہے

میں یہ رو رہا ہوں ماؔنی، کہ نہ بل سکا وہ دامن
مرے آنسوؤں کی قسمت، یہی میری آستیں ہے

۹۹ غزل

اپریل ۱۹۲۹ء

نہ فقط یہ کہ میں اب درخورِ محفل نہ رہا
پاس میں دل بھی تمناؤں کے قابل نہ رہا

اغنا کا کبھی محتاج غمِ دل نہ رہا
نہ سُنا گُل نے تو کیا شور عنادل نہ رہا

دل کا مقصود خدا جانے کہاں ہے کیا ہے
کہیں آسودہ بہ بیگانۂ منزل نہ رہا

جان بھی کیوں نہ فدائے کرمِ برق کروں
اب کہ اندیشۂ بربادیِ حاصل نہ رہا

اُٹھ سکے ہیں نہ اُٹھیں گے یہ حجاباتِ نظر
غش کا پردہ تو ہے، کچھ اور جو حائل نہ رہا

یہہ مٹا اور نمایاں اثرِ حسن ہوا
تم کو آئینہ ملا، اور مرا دل نہ رہا

لذتِ دردِ تمنا ہے فقط حاصلِ عشق،
جب تمنا ہوئی حاصل، کوئی حاصل نہ رہا

جہد ہے رازِ بقا، سعی ہے تصدیقِ حیات
زندگی کیا جو کوئی مطلبِ مشکل نہ رہا

اب جو شاعر ہے وہی ہمسرِ غالبِ ثانی
مجھ سا ناقص بھی، تو کامل ہے کہ کامل نہ رہا

۱۰۰ - خاکسترِ مشتعل

اگست ۱۹۲۹ء

آج پھر کیا چیز ہے سینے کے اندر مشتعل — پھر خدا جانے کہاں سے آگیا پہلو میں دل
میں سوائے خاک پاتا ہی نہ تھا دل کا نشاں — تجھ کو خاکستر میں کیونکر مل گئیں چنگاریاں
لے کے جن چنگاریوں کو شعلہ ساماں کر دیا — داغ روشن کر دیے یکسر چراغاں کر دیا

یا مجھے بیگانۂ سوزِ محبت دیکھ کر، جوشِ غیرت میں غرورِ حسن نے ڈالی نظر

مشقِ تخلیقِ شرارِ بے نشاں کرنے لگا اس طرح اپنے اثر کا امتحاں کرنے لگا

آگ پیدا کی شعاعِ عشوہ و انداز سے آگ میں بھڑکا دیے شعلے ہوائے ناز سے

یا یہ فطرت حسن کی ہے جو بروئے کار ہے جلوہ افروزی بشوقِ گرمیٔ بازار ہے

واقعی ذوقِ نمائش اقتضائے حسن ہے کس کو تابِ یک نظر ہے، یہ صلائے حسن ہے

برقِ پاشِ جلوہ کو اِس کی ذرا پروا نہیں ہوش کھو بیٹھے کوئی یا آگ لگ جائے کہیں

یا یہ نسبت ہے کہ دل آئینہ ہے تو آفتاب یوں ہوئی آغوشِ دل جلوے سے تیرے کامیاب

کیوں نہیں تو حسن ہے، تیری طبیعت فیض ہے تیرا سرمایہ محبت، تیری طینت فیض ہے

آئینہ کیا، جب نوازش تیری آئے جوش میں تیرے پرتو سے ہے تابش ذرۂ روپوش میں

کوئی صورت بھی ہو، استعداد لازم ہے مگر جوہرِ قابل ہو تب ہوتی ہے ترتیبِ اثر

آبِ نیساں ہے گہر، لیکن صدف کے واسطے ہے سعادت مہر میں برجِ شرف کے واسطے

کیا اُگائے سبزہ نم ہیں جب نہ ہو مٹی گی کیا جلائے برق، اہلیت تو ہو کچھ خاک کی

مجھ میں استعداد کیا، ایسی بلا کی بے حسی بے دلی ہے اس کے ہاتھوں جس کی بنا پڑی

تو نے اس عالم میں کیونکر سوز پیدا کر دیا دل تو خاکستر تھا، کیسے دل کو شعلہ کر دیا

سحر ہے، یہ خرقِ عادت ہی، یہ اعجاز ہے — جس کی حامل ایک تیری ہی نگاہِ ناز ہے

آسمانِ حسن کی زہرہ ہی دہ قدرت تجھے — نذر دیتا ہے فرشتہ ہدیۂ الفت تجھے

تو لگائے آگ پانی میں کہ چھپا جا دھواں — تو جھکائے عصمتِ قدسی کو بابل کا کنواں

آہ، تو اور رافیِ ناکام کی بزمِ حیات — کیا ترے جلوے کو کم تھی یہ فضائے کائنات

۱۰۱- غزل

ستمبر ۱۹۲۹ء

دمِ واپسیں ہے آخر، ترا انتظار کب تک

رہے چشمِ منتظر ہیں مری جانِ زار کب تک

یہ درست ہے کہ جلتا ہی چراغ بھی تو لیکن

وہ سرِ مزار کب تک، میں تہِ مزار کب تک

تری قدرتیں ہیں ثابت، تری بے نیازیوں سے

کہ نیاز رہنے دیتا سرِ اقتدار کب تک

میں ہوا تباہ جتنا، ہے فروغِ حسن اتنا

یہ خزاں مگر کرے گی مددِ بہار کب تک

یہ صلاح چارہ گر کی ہے کہ مرگ ناگہاں کا
کروں انتظار مانیؔ، مگر انتظار کب تک

۱۰۲۔ غزل

اکتوبر ۱۹۲۹ء

اُن کا دن اُن کی رات ہے مانی — اُن کی سب کائنات ہے مانی
زندگی اُن کے ہات ہے مانی — میرے کیا بس کی بات ہے مانی
اُٹھ بھی جائیں جو اور سب پردے — تو حجابِ صفات ہے مانی
اجرِ آلام روزگار ہے عشق — عشق یعنی نجات ہے مانی
میرے نقصِ وجود سے ثابت — اُس کی تکمیلِ ذات ہے مانی
موت کو عہدِ غم میں ڈھونڈھتے ہو — موت بھی کیا حیات ہے مانی

دیکھوں ہوتی ہے کس جہاں میں سحر
میں ہوں اور غم کی رات ہے مانی

---

۱۰۳ غزل

نومبر سنہ ۱۹۲۹ء

ہوش نے امتحاں سے دل ہی نہ باز آئے کیوں
جلوۂ حیرت آفریں طعنۂ شوق اُٹھائے کیوں

اک ازلی رفیق تھا، سچ ہے نہ یاد آئے کیوں
ماتمِ دل بجا، مگر، دل ہی تو مٹ نہ جائے کیوں

تجھ سا کوئی حسیں نہیں، کوئی نہیں کہیں نہیں
ورنہ تجھی تک آرزو، آخرِ کار آئے کیوں

موت مآل زیست ہی، زیست سے دل مراد ہے
حاصلِ دل کہ درد ہے، جان کے ساتھ جائے کیوں

اچھی بُری ہر آرزو دل کی، تری نظر میں ہے
ایک کو دل دکھائے گیا، ایک کو دل چھپائے کیوں

وہ بھی تھی اُن کی مصلحت، یہ بھی انہیں کی ہی خوشی
عیش میں جب سرور تھا، غم میں یہ ہائے ہائے کیوں

سمجھے وہ کیا جو بے خبر لذتِ بندگی سے ہے
حسنِ جبینِ سجدہ ریز، اُس کی نظر میں آئے کیوں

عتبۂ جلوہ گاہِ ناز، خود ہے عبودیت طراز
دعوتِ سجدۂ نیاز، اہلِ جبیں کو آئے کیوں

مانیِ رند کچھ نہیں، صاحبِ دل نہ اہلِ دیں
دیر ہو یا حرم، کہیں آئے تو آخر آئے کیوں

۱۰۴۔ غزل

نومبر ۱۹۲۹ء

دل کی فنا پہ غم کی فنا کا مدار ہے — لیکن فنائے دل کا کسے اعتبار ہے
عمرِ ابد بھی ہو تو ترا انتظار ہے — آخر تو دل ہی، اور دلِ امیدوار ہے
یا رب مرا جنوں ہی کرشمہ بہار کا — یا میرے ہی جنوں کا شگوفہ بہار ہے
ہے صرف لذّتِ المِ عشق ہر نفس — کس کو یہاں سرِ الم روزگار ہے
ہاں سچ ہے ذمہ دارِ عمل ہی مرا وجود — لیکن وجود جبر ہے یا اختیار ہے
اک شعبدہ اُمید کا تھا اضطرابِ دل — اعجازِ یاس یہ ہے کہ گویا قرار ہے

معلوم ہو سبب تو بتاؤں سبب تمھیں اتنا ہی جانتا ہوں کہ دل بے قرار ہے

انجام کا لقب نگہہ واپسیں ہُوا حالانکہ یہ وہی نگہہِ انتظار ہے

باقی ہی اُن کا حُسن، تو کس کے لئے فنا

مانی، جہاں تو سب تہِ دامانِ بار ہے

غزل ۱۰۵

دسمبر ۱۹۲۹ء

بچائے رکھتا ہے اے صبر آبرو میری

یہ اعتبار کہ ظالم ہے آرزو میری

کہاں کہاں رہی آوارہ جستجو میری

خبر نہ تھی کہ مرا دل ہے آرزو میری

میں اپنے آپ کو کھو دوں تو کوئی بات نہیں

کہ تیرے دل میں بھی پیدا ہو جستجو میری

تو ہی بتا دے کہ پھر حشرِ آرزو کیا ہے

میں تیری بات نہ سمجھوں، سنے نہ تو میری

مری وفا سے خفا ہو، تو یہ جفا کب ہے
ستم تو یہ ہے کہ چھٹتی نہیں یہ خو میری

یہاں کے صبر کی آخر، کہاں ملے گی جزا
ارے یہ حشر ہے، کچھ سُن لے دو بدو میری

کھٹک ہوئی تھی زرا کم، کہ میں نے زخمِ جگر
سیا، تو ٹوٹ رہی سوزنِ رفو میری

وہ ہے زبانِ زدِ ہر ذرۂ جہاں کیونکر
ہوئی خیال میں تجھ سے جو گفتگو میری

دل اُس نظر نے ٹھکانے لگا دیا ثانی
پناہ پا گئی آخر کو جستجو میری

۱۰۶۔ غزل

دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء

سرنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے
واہ کیا حسنِ تقاضائے جبیں سائی ہے

میری حیرانیوں کی حوصلہ افزائی ہے
سامنے میں ہوں، وہ مصروف خود آرائی ہے
ناشکیبا ترے جلووں کا تماشائی ہے
کہ نظر، دشمنِ دعوائے شکیبائی ہے
دل ہے پابندِ ادب، ورنہ کوئی بات نہ تھی
ایک ہی سانس تو حدِ شبِ تنہائی ہے
کب تھی، اور کس کی نگاہوں میں تھی شانِ جمال
لے کہ بیگانۂ اُلفت تری رعنائی ہے
ہاں یہ سچ ہے، کوئی مجبور ہے، کوئی مختار
ورنہ محبوب کا طالب ہے جو شیدائی ہے
حیرتِ دل ہو کہ وارفتگیِ ہوش کہ موت
کچھ نہیں، ولولۂ دادِ تماشائی ہے
آتی ہے تیری ہی آواز، جدھر جاتا ہوں
تو نے کی بات، تو ہر ذرّے میں گویائی ہے

میں ہوں دیوانۂ اسرارِ بہار اے مآنی
یہ تو سب دیکھ رہے ہیں، چمن آرائی ہے

۱۰۷- غزل

جنوری ۱۹۳۰ء

ہاں، مری موت بھی اک نوبتِ حیرانی ہے
بند ہے آنکھ، کہ جلووں کی فراوانی ہے

چاہتی ہے کہ کرے غم کا مداوا غم سے
کس قدر عربدہ جو فطرتِ انسانی ہے

نفسِ اولِ اُلفت تھا دلیلِ مقصود
میں ہوں واماندۂ منزل یہ گراں جانی ہے

کس کے دم سے ہے نمودِ اثرِ جلوۂ برق
کس کا آئینۂ مری سوختہ سامانی ہے

میں ہوں اور جبر کہ ہو قطع مسلسل رہِ غم
موت وقفہ سہی، لیکن کوئی امکانی ہے

حدِ احساس سے اب ہے متجاوز غمِ دل
باعثِ دشوارئِ منزل، کہ یہ آسانی ہے

ماسوا اللہ ہیں دل بھی سہی، لیکن ماؔنی
ماسوا کو ہے فنا، دل بھی کہیں فانی ہے

۱۰۸۔ غزل

مارچ ۱۹۳۰ء

جس کو تیرا ستم مٹا نہ سکا — وہی دل تابِ لطف لا نہ سکا
اُن کو رودادِ غم سُنا نہ سکا — میں مقدر بھی آزما نہ سکا
کچھ نہیں ماجرائے طور و کلیم — دل تھا، یارائے دید لا نہ سکا
یاد بھی تو نے محو کی میری — میں ترا بھولنا بھُلا نہ سکا
بندہ آئینۂ خدائی ہے — سجدہ، شانِ جبیں مٹا نہ سکا
دل کی تعمیر یوں ہوئی ہے کہ عشق — ظرفِ کونین میں سما نہ سکا

میں ہوں وہ مظہرِ لقا ماؔنی
جس کو دستِ فنا مٹا نہ سکا

۱۰۹۔ غزل

مارچ ۱۹۳۰ء

سعیِ مشکور ہوئی آپ کے دیوانوں کی
خاک ہے دیدۂ گردوں میں بیابانوں کی

ذرّہ صحرا ہے نظر میں ترے دیوانوں کی
کنجِ زنداں میں فضا گم ہے بیابانوں کی

سب ہیں معلوم حضورِ حرم کے آداب
مَیں نے جاروب کشی کی ہی صنم خانوں کی

ہم سے وابستہ ہی اے حسن، ترا حُسنِ شہود
درخورِ شمع، فضائیں ہیں سیہ خانوں کی

خاک میں ڈھونڈھ لے مانیؔ، طلبِ جاہ سے قبل
کلغیاں قیصر و فغفور کے ایوانوں کی

۱۱۰۔ غزل

اپریل ۱۹۳۰ء

بے تکلف یاس پہنچاتی لبِ ساحل مجھے
آہ لے ڈوبا مرا پندارِ جذبِ دل مجھے

ہاں مٹا دیتا مآلِ سعی لاحاصل مجھے
وہ تو یہ کہئے، درِ قسمت پہ لایا دل مجھے

چھُٹ کے منزل نے کیا مستغنی منزل مجھے
کون جانے اب کہاں لے جا رہا ہے دل مجھے

میں کبھی باطل کو بھی حق دیکھتا ہوں اور کبھی
جو حقیقت ہے نظر آتی ہے، وہ باطل مجھے

اور کیا دیتے ازل کے دن، عطا فرما دیا
ایک بختِ نارسا، اک ناشکیبا دل مجھے

وہمِ ہستی مجھ کو ہرگز دے نہیں سکتا فریب
باش اے ذوقِ فنا، معلوم ہے منزل مجھے

ہوشیارِ بے خودی ہوں، ورنہ راہِ عشق میں
عقل بہکاتی، اگر پاتی کہیں غافل مجھے

۱۱۱-غزل

اگست ۱۹۳۰ء

روکشِ سلطنت ایازی ہے — واہ کیا شانِ بے نیازی ہے
لذّتِ سجدہ تجھ کو کیا معلوم — یہ مرا حقِ امتیازی ہے
قدر میری، ترے ستم سے کھلی — یہ جفا کیا، وفا نوازی ہے
کون ہے جو نہیں ہے سر بسجود — جلوہ ریزی، جبیں طرازی ہے
جتنا اونچا ہو آستاں تیرا — اتنی ہی میری سرفرازی ہے
وہی دل میں، وہی نگاہوں میں — جو حقیقی، وہی مجازی ہے

چارہ سازی کرو اگر مانی
درد محتاجِ چارہ سازی ہے

۱۱۲ غزل

نومبر ۱۹۳۰ء

درد ہی درد ہے دل، درد سے ناشاد نہیں
یعنی اب طاقتِ فریاد ہے، فریاد نہیں

جس میں بھولا تجھے، برباد ہے وہ لمحۂ زیست
زندگی کا کوئی مفہوم بجز یاد نہیں

بال و پر، سعیِ رہائی میں ہوئے نذرِ قفس
اب جو آزاد ہوا بھی ہوں، تو آزاد نہیں

بے خودی میں نہ تصوّر ہے نہ احساسِ فراق
یہ وہ عالم ہے، جہاں تو ہی، تری یاد نہیں

اُن کو تاکید کی حاجت ہی نہ تھی اے مانیؔ
شیوۂ اہلِ وفا شیون و فریاد نہیں

۱۱۳-غزل

دسمبر ۱۹۳۰ء

اندازہ نزا کیا ہے، وہ کیا جانئے کیا دے
رکھ ظرفِ تمنّا یونہی اُس در پہ صدا دے

حسرت نہیں، حیرت کے لئے جلوہ دکھا دے
آ-درسِ تمنا نہ سہی، ذوقِ فنا دے

غم ایک ہی ایسا ہے کہ دنیا کو بھلا دے
غم کیا ہے وہ نعمت ہے، مگر جس کو خدا دے

آزردہ نہ ہو بے حسی صبر و رضا سے
بیداد نہ کر ترک، یونہی دادِ وفا دے

بیگانگی ہوش ہے عرفانِ محبّت
اور اس سے سوا کیا نگہہ ہوش ربا دے

یا رحم کے ساتھ آئے ترے دل میں مری یاد
یا پھر جو بھلا سکتا ہو مجھ کو تو بھلا دے

مستغنیِ ساحل نہیں دریائے محبّت
دم لینے کی فرصت بھی کہیں موج فنا دے

جس ذرّے کو دیکھوں وہ بنے وادیِ ایمن
تارِ نظر و برقِ تجلّی کو ملا دے

اُس نقشِ کفِ پا میں ہے جو رفعتِ پنہاں
وہ تیری جبیں میں ہی، ذرا سر تو جُھکا دے

اعجازِ نظر ہے کہ رہی دل میں و گرنہ
ہے کون جو ذرّے کو بیاباں کی فضا دے

دل منزلِ مقصود سے آگاہ ہے ماؔنی
دل ہی نہ بتائے تو تجھے کون بتا دے

۱۱۴۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۰ء

ہائے وہ دِل، جسے اندوہ کا یارا بھی نہ ہو
منّتِ چارۂ اندوہ گوار بھی نہ ہو

کیوں نہ بے باک ہوں جلوے کہ نظر قاصر ہے
اور اگر تابِ نظر ہو، تو نظارا بھی نہ ہو

ہے تغافل بھی کرم، ورنہ میں سمجھوں کیونکر
لطفِ پنہاں کا اگر کوئی اشارا بھی نہ ہو

کوئی کھٹکا نہ اُداسی کا نہ ویرانی کا
دل تو ہے، چاہے تو اب انجمن آرا بھی نہ ہو

ہر نفس خیر سے پیغامِ اجل ہے، ورنہ
کیا ہو، تسکیں کا جو یہ ایک سہارا بھی نہ ہو

جان دینا ادبِ عشق تھا اور سحر نظر
میں یہ سمجھا کہ کہیں اُس نے پُکارا بھی نہ ہو

جس کو کہتا ہے وفا بے کسیٔ مانی ہے
کس کا ہو کر رہے آخر جو تمہارا بھی نہ ہو

۱۱۵- رموزِ حقیقت

(۱) نیرنگِ ہستی

فروری ۱۹۳۱ء

بنا ہے جس کی عدم، وہ طلسم ہے دنیا
فریب، روح ہے جس کی، وہ جسم ہے دُنیا

جو کچھ بھی ہے، کبھی معدوم ہے کبھی مشہود
ذرا نہیں ہے یہاں اعتبارِ بود و نبود

وہ دولتیں، جنھیں کہتے ہیں لوگ زیبِ حیات
نہیں کچھ اور بجز مایۂ فریبِ حیات

عجیب رسم یہاں کی عجب یہاں کا طریق
وہ کچھ نہیں ہی، نظر جس کی کر سکے تصدیق

جو چیز پائی تھی کل، آج ہو گئی مفقود
وجود جس کا مسلّم ہے، وہ نہیں موجود

کسی اصول پہ مبنی نہیں کوئی روداد
حقیقتیں نظر آتی ہیں کس قدر متضاد

حریمِ غیب کبھی جلوہ دارِ بزمِ شہود
کبھی ہے غیب حدودِ شہود میں محدود

کسی جگہ ہے دلیلِ وجود محض علم
کہیں وجود ہے محتاجِ شانِ کیف و کم

نہ لعنتوں کے لئے کوئی امتیازِ صفت
نہ حوصلوں کے لئے کوئی قیدِ شخصیت

بجائے رحم، کسی کے لئے ہزار آلام
کسی کو ملتا ہے تعزیر کی جگہ انعام

کبھی جزا ہی نہیں رنج و دردمندی کی
کبھی سزا ہی نہیں کبر و خودپسندی کی

کبھی تو فطرتِ انساں ہے اس قدر آزاد
حریفِ خسروِ پرویز بے نوا فرہاد

کبھی یہ ایسی رسوم و قیود کی پابند
کھڑا ہے دور صفِ اغنیا سے حاجتمند
کہیں نفاق کا زہراب اور جامِ خلوص
ہیں کینہ پروریاں، اور بچھا ہے دامِ خلوص
کہیں ہے جلوہ فزا حسنِ اہتمامِ عمل
کہ ہیں خلوص میں قربانیاں نظامِ عمل
کہیں وفاؤں کے پردے میں ہے جفا کاری
کہیں ہے لطفِ عیاں میں نہاں دل آزاری
یہ حالتیں ہیں، یہ نیرنگیاں ہیں اور جینا
اب اس کو زیست کہو چاہے خونِ دل پینا
کسی طرف نہیں تسکین کا کوئی پہلو
قرار کس کو یہاں، لا الٰہ الا ہو
اک اضطراب ہے، فرماں روائے شام و سحر
ہے عیشِ وصل میں بھی صدمۂ فراق کا ڈر

دلم[1] چو قبلہ نما فارغ از تپیدن نیست
بعالمے کہ منم ، رسمِ آرمیدن نیست

(۲) استغنائے قدرت

سکونِ دل کی تمنا ، اصول کی جویا
نہاں اُصول میں تسکیں کا راز ہے گویا
مگر یہ جبر کرے کیسے اختیار پسند
نہیں ہی قدرتِ مطلق ، اصُول کی پابند
بلا سے ، ہو کہ نہو قلبِ زار کو تسکیں
مگر قیودِ ضوابط میں اقتدار نہیں
فلک فلک پہ جدا شانِ جلوہ تازی ہے
جہاں جہاں میں نیا رنگِ بے نیازی ہے
عذابِ روح کہیں اہلِ مدعا کے لئے
کھُلا ہے بابِ اجابت کہیں دُعا کے لئے

[1] شیخ علی حزیں مغفور۔

کسی کو مٹ کے ملی زندگانیِ جاوید
کسی کی نصرتِ ظاہر ہنی شکستِ شدید
تنوعاتِ تجلی سے پُر ضیا آفاق
سمجھ رہے ہیں اشاروں کو جا بجا عشاق
کبھی صنم کدۂ آزری ہیں ابراہیم
چراغِ دل تہِ دامن لئے ہوئے ہیں مقیم
جلائی شمعِ ہدایت کبھی سرِ دربار
کبھی دھکتی ہوئی آگ کو کیا گلزار
وفورِ ناز کے بے حد و بے شمار گواہ
عیاں زمانے میں ہی قصۂ کلیم اللہ
درِ عدو پہ کبھی سعیِ باریابی ہیں
کبھی پہاڑ پہ امیدِ جلوہ تابی ہیں
خزینہ ہائے کرم زیرِ حکم قدرت ہیں
تمام گنجِ حکم تابعِ مشیت ہیں

عطائے خاص سے عفت کو سرفراز کیا
دروپدی کے لئے پیرہن دراز کیا
یہہ اتہام نہ بھایا کہ پاک باز نہیں
ثبوتِ عصمتِ سیتا میں شق ہوئی ہے زمیں

تغافل، اور تغافل میں التفات نہاں
تلطف، اور تلطف میں قہر کے ساماں

رواں ہے بحر میں تختے پہ ماں اور اک بچا
کنارہ دور ہے، دم ٹوٹتا ہے ماں کا
وہ بے کسی ہے کہ دکھتا ہے موت کا بھی دل
وہ شیر خوار کہ ہے جس کی زندگی مشکل

جواں ہوتا ہے، شانِ خدا دکھاتا ہے
جہاں بناتا ہے، موتی کا در بھی پاتا ہے
ہنوز داخلِ در ہو نہیں سکا کہ قضا
پہنچ کے عقدۂ پندار کر چکی ہے وا

ہر آنچہ در نظر آید، طلسمِ رازِ کسے است
بہارِ ہستیِ عالم، فسونِ نازِ کسے است

(۳) نازِ کبریائی

یہ شانِ ناز کی ساری کرشمہ سازی ہے
وہ شانِ ناز کہ تا حدِّ بے نیازی ہے
اُسی کے واسطے زیبا ہے کبر و استغنا
جسے نہ دوست کی حاجت نہ خطرۂ اعدا
وہ عجزِ خاک ہو یا سرکشیِ ناز، مگر
اُس آستانِ مقدّس کو نفع ہے نہ ضرر
اگر ہے عتبۂ عالی پہ کوئی سر بسجود
سمجھ کہ سجدے سے ہے رفعتِ جبیں مقصود
کہیں اگر نظر آئے مجالِ سرتابی
سمجھ کہ معرفتِ نفس کی ہے نایابی

جو دم گزرتا ہے، قدرت کی ڈھیل اُس کو سمجھ
کمالِ قہر و غضب کی دلیل اُس کو سمجھ
پناہ مانگ، یہ فرصت کی وہ درازی ہے
جو کارِ آخرِ تنبیہِ بے نیازی ہے
تمام کبر ہے شایانِ شانِ ذاتِ احد
بشر کے واسطے ہے طوقِ لعنتِ سرمد
غرور شرک ہے، اور شرک باغیانہ گناہ
اِسی گناہ نے ہامان کو کیا ہے تباہ
زبانِ پشہ سے نمرود کی روایت سُن
دہانِ نیل سے فرعون کی حکایت سُن
طلاؤ نقرہ بہ عنوانِ سنگ و خشت کہاں
بساطِ ارض پہ شداد کی بہشت کہاں
ابد ہے اور ازلی معدلت پناہی ہے
روا نہ ظلم نہ پندارِ بادشاہی ہے

نتیجہ خیز ہے ہر روئدادِ مظلومی
بقدرِ صبر ملی سب کو دادِ مظلومی
ہنوز رام کی ذریت اس جہاں میں ہے
کوئی زمیں پہ نہ راون کے خاندان میں ہے
گزر تو کربسوِ درگہہِ حسینؑ شہید
فضا میں ڈھونڈھتی ہیں لعنتیں نشانِ یزید
کم اب بھی شوکتِ دربارِ شاہِ طوس نہیں
مگر زمانے میں اب کوئی زارِ روس نہیں
گناہِ بد ہے تعدّی خدا کے بندوں پر
ہر اپنی خیر کا طالب، تو اپنے شر سے ڈر
ضرور شانِ رحیمی پہ اعتقاد رہے
خدا رحیم ہے، لیکن یہ بات یاد رہے
عبودیت سے تجاوز کبھی نہیں ہے روا
ہیں قہر و عدل بھی منجملۂ صفاتِ خدا

بشانِ ناز چو آہنگِ ترک تاز کند
بساطِ کون و مکان پائمال ناز کند

(۴) منازلِ معرفت

بساطِ کون و مکاں کی کوئی حقیقت ہے
قیاس و وہم سے بالاتر اُس کی قدرت ہے
یہ کائنات کہ ثابت بھی ہو جو اس کا وجود
تو کچھ نہیں ہے، مگر ایک حکمِ کُن کی نمود
نیا پیامِ تغیّر ہے، اس میں جو دن ہے
نگاہ کر کہ یہ سب شرحِ لفظِ ممکن ہے
یہ کائنات کہ کہتے ہیں جس کو بزمِ شہود
بہت عظیم سہی، پھر بھی کب ہے لامحدود
تمام خلق کا احصا بڑا کمال سہی
ہماری فہم و نظر کے لئے محال سہی

مگر بایں ہمہ سب قابلِ تعین ہے
کہ جو بھی ہے وہ بقیدِ احاطۂ کُن ہے
نجوم و کوکب و مہر و مہ و زمین و زماں
جحیم و خلد و بہار و خزاں، مکین و مکان
بہت اہم، مگر اُس بارگہ میں کچھ بھی نہیں
حقیقت اِن کی ہے صرف اک کرشمۂ تکویں
شہود اِن کا ہے برہانِ شانِ خلاقی
حدوث اِن کا دلیلِ قدم، ہو الباقی
کہاں کہاں کوئی دیکھے، کیسے کیسے سمجھے
ہیں ذرّے ذرّے میں جلوے وجودِ واجب کے
"ھل" اور دل کی ہدایت کو شوق سا رہبر
جہاں گیا، وہیں تھا ذکرِ منزلِ دیگر
ہوا سوادِ انا الحق میں جب قیامِ گزیں
سنا کہ دار و رسن پر بھی راہ ختم نہیں

بڑھا کچھ اور، تو تھی انتہائے حیرتِ دید
وہ قطرہ ہائے سیاہی میں شانِ ربِّ مجید
جب آیا قطعِ رہ و رسمِ ماسوا کا مقام
تو زیرِ ارّہ یہ دیکھا کہ آہ تک تھی حرام
عجب محلِّ تحیر کہ دل کو سکتا تھا
پسر کا نام بھی اک باپ لے نہ سکتا تھا
ملی جو بعد مراحل کے ایک خلوتِ راز
تو "ماعرفتک ربی"، کی آتی تھی آواز
جب اِس کے بعد ہوا انتظارِ بانگِ درا
حریمِ قدس سے دل نے سُنی اک اور صدا
"پتہ یہ ہے کہ نہیں کوئی کفوِ ذاتِ احد
خدا ہے پاک و صمد، لم یلد و لم یولد"
رُکا ارادۂ دل، جُھک گئی جبینِ نیاز
کہ تھی یہ منزلِ آخر کی آخری آواز

نہ دانم ایں کہ چساں ذاتِ او چساں صفت است
یقین عاجزیِ فہم، حدِ معرفت است

غزل-۱۱۶

اپریل ۱۹۳۱ء

اے عشق مجھے ہوش سے بیگانہ بنا دے
اِس غم کی حقیقت کو اب افسانہ بنا دے

جلوے کو مے، اور شوق کو پیمانہ بنا دے
جو چاہے، مری جراتِ رندانہ بنا دے

غافل نہ ہو، یوں دل کو نہ ویرانہ بنا دے
کعبہ نہیں بنتا تو صنم خانہ بنا دے

عالم کی بہار اُس کا اک اندازِ جنوں ہے
دیوانہ جسے جلوۂ جانانہ بنا دے

ہے برگِ خزاں دیدہ میں رودادِ بہاراں

تو ہوش سے دیکھے، تو بہ دیوانہ بنا دے

اصلاح تو کر پہلے مری فردِ عمل کی
ہر جرم کو اک لغزشِ مستانہ بنا دے

اک ذرّۂ اُمید ہے ڈیبے کہ مرا دل
اِس ذرّے کو اب حشر کا صحرا نہ بنا دے

جب برق نے پھونکا ہے مری قیدِ مکاں کو
کیوں اپنی تجلی میں نہ کاشانہ بنا دے

مآنی وُہی مستغنیِ احسان اجل ہے
جس کو وہ نظر زیست سے بیگانہ بنا دے

۱۱۷۔ غزل

مئی ۱۹۳۱ء

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم
مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

طلب ہے وہم، کہ مطلوبِ دل ہے نامعلوم

دُعا تو جب ہو کہ ہو پہلے مدعا معلوم

یہ اعتقادِ قیامت، امیدِ داد بھی ہے
وگرنہ سوزِ غم ہا اور اُس کی انتہا معلوم

اُس آستاں سے مرا سر ہٹے تو کیسے ہٹے
غنی کی شان عیاں، عادتِ گدا معلوم

مری خطا کہ نہ صحت ہوئی مجھے ورنہ
کمالِ چارہ گر دردِ مدعا معلوم

ستم نہ ترک کرد، زحمتِ کرم نہ کرد
مجھے ہے ظرفِ دلِ درد آشنا معلوم

کچھ ایسا غم تھا کہ جاں بر نہ ہو سکا فانی
مآل سے ہوا آتنا کہ ماجرا معلوم

غزل ۔ ۱۱۸

اکتوبر ۱۹۳۱ء

مآلِ غم ہے غم، امیدِ تاثیرِ فغاں کیسی

جنوں، سازِ جنوں ہے، پیرہن کی دھجیاں کیسی
بُرا ہو خانہ ویرانی کا، گم ہیں بجلیاں کیسی
تمنا برق کی رکھتا ہوں، طرحِ آشیاں کیسی
کسی کا شکوہ بن کر بھی نہ نکلا رنجِ ناکامی
مقدر ہو کے رہ جاتی ہے سعیِ رائیگاں کیسی
کہوں کیا، دل پہ کیا گزری ہے اور کیا کیا گزرتی ہے
کہ تابِ زندگی باقی نہیں، تابِ بیاں کیسی
وہی مقصودِ سنگِ در، وہی مفہوم پیشانی
سلامت سجدۂ تعبیرِ جبیں و آستاں کیسی
زمینِ فرخ آباد آسماں ہے، ورنہ لے آتی
قدم رکھتے ہی اٹھتی شدتِ دردِ نہاں کیسی
غم ایسا غم کہاں، احساس باقی ہے ابھی باقی
ابھی بے خود نہیں ہو، ورنہ یہ بے تابیاں کیسی

۱۱۹۔ غزل

نومبر ۱۹۳۱ء

جو سانس ہے، اک منزلِ عرفان و یقین ہے
درکار مرے سجدے کو در ہے نہ جبیں ہے

اب تک درِ جاناں کے تجسس میں جبیں ہے
گویا کہ تعارف رگِ گردن سے نہیں ہے

منزل ہے کہ اب ساتھ مرے کفر نہ دیں ہے
سب ایک طرف، تیری تمنا بھی نہیں ہے

تھی اک نگہِ ناز تری دولتِ کونین
اب دل ہے، سو دنیا ہے، تجھ ہے، سو دیں ہے

آنکھوں میں ہے دم جوشِ تمنائے نظر سے
کس درجہ مجھے آپ کے وعدے کا یقیں ہے

دل حیرتیِ جلوہ ہے، اور جادۂ حیرت
جس ذرے کو آغوش میں لے لے، وہ حسیں ہے

دنیا ہو کہ محشر ہو، ازل ہو کہ ابد ہو
سب ایک ہیں، تو کون سی منزل میں نہیں ہے

کیا جانیے کیا زندگی و موت میں ہے فرق
اتنا تو میں سمجھا یہ گماں ہے وہ یقیں ہے

دل ہو کہ نہ ہو، عشق تو ہے اور رہے گا
یہ نقش بھی مانیؔ کہیں محتاج نگیں ہے

۱۲۰۔ غزل

نومبر ۱۹۳۱ء

نغمۂ یاس جو چھیڑا شبِ تنہائی نے
رکھ دیا سازِ تمنا ترے سودائی نے

منزلیں کاٹ دیں کتنی شبِ تنہائی نے
سانس لی حشر میں آکر ترے سودائی نے

رازِ خلوت ہی سے وابستہ ہے نازِ جلوت
خود نمائی کو ابھارا ہے خود آرائی نے

اب تو بیزار نہ رہیئے کہ قیامت آئی

لیجیئے، شکل بدل دی مری رسوائی نے

رہبری سے نہ سہی ٹھوکریں کھا کھا کے سہی

آستاں ڈھونڈھ لیا تیرے تمنائی نے

مجھ پہ الزام نہیں راز کیا تھا رسوا

میری فریاد سے پہلے تری رعنائی نے

دل کو کیا کیا نہیں دی ذوقِ فنا کی تعلیم

تیرے جلوے نے، مری تابِ شکیبائی نے

سجدہ معلوم نہیں کس نے کیا ہے پیدا

اوجِ درگاہ نے یا ذوقِ جبیں سائی نے

موت نظارے کا مقصود ہے دیکھ اے فانی

طے کیا منزلِ حیرت کو تماشائی نے

لالہ لبھا رام مینیجر نے مفید عام پریس واقع نکلسن روڈ دہلی میں چھاپی اور
لالہ موتی رام مینیجر نے منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز دہلی سے شائع کی۔